ماہنامہ

قومی زبان

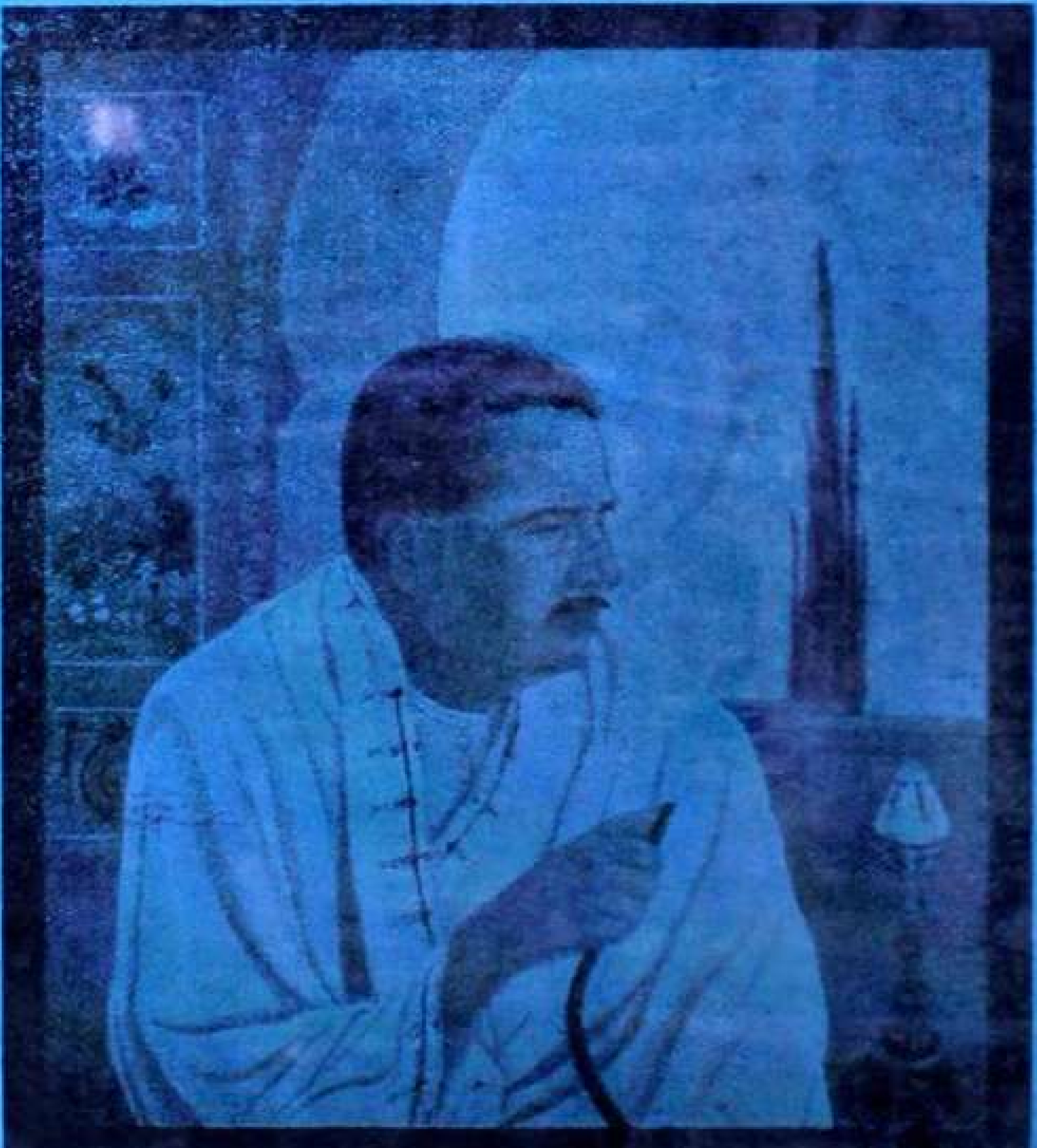

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ کراچی ۱

ماہنامہ

قومی زبان

کراچی

نومبر ۱۹۷۹ء

★

جلد ــــــــــــــــــــــ ۴۹

شمارہ ــــــــــــــــــــــ ۱۱

قیمت فی پرچہ ــــــــــــــــــــــ ایک روپیہ پچاس پیسے

سالانہ قیمت ــــــــــــــــــــــ پندرہ روپے

بیرون ملک ــــــــــــــــــــــ ستائیس ۲۷ روپے

★

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ۔ کراچی نمبر ۱

فون : ۲۱۷۱۳۷

فہرست

اداریہ		۳
مفکر و مصور پاکستان ڈاکٹر علامہ اقبال مرحوم تقویم کے آئینہ میں	سید علی اکبر شاہ کاظمی	۵
اقبال اور یاران اقبال	ڈاکٹر آفتاب احمد ردولوی	۱۵
خوشحال و اقبال	محمد پرویش شاہین	۲۲
اقبال زمان سے لازمانیت تک	ریاض صدیقی	۲۷
اقبال ۔ عاشق رسول ؐ	سید اعظم رضوی	۳۳
اقبال اور تعلیم	نوید ظفر	۴۲
اقبال اسلام اور اشتراکیت	دردانہ جلیل ایم اے	۴۷
نئے خزانے	ابو سلمان شاہجہان پوری	۵۳

ادارۂ تحریر

جمیل الدین عالی

سید شبیر علی کاظمی

اداریہ

نومبر کا مہینہ شاعر مشرق، مفکر پاکستان علامہ اقبالؒ کی پیدائش سے منسوب ہے۔ لہٰذا ادبی خراج عقیدت کی طور پر قومی زبان کا یہ شمارہ علامہ کی یاد میں قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ خصوصی شمارے کے لیے مضامین کی فراہمی سے اشاعت کے مرحلے تک پہنچنا نہایت صبر طلب اور ہمت شکن کام ہوگیا ہے۔ تاخیر اشاعت کا بھی یہی موجب ہے۔ بہر صورت موجودہ حالات میں جو بن پڑا وہ حاضر ہے۔ مشمولہ مضامین مختلف نوعیت کے ہیں۔ مگر ان تمام کا مقصد بالعموم علامہ کے افکار و نظریات کو مختلف انداز میں پیش کرنا ہے۔ اعلیٰ افکار کی یہ خاصیت ہے کہ ان کا قاری ان کو اپنی بساط کے مطابق سمجھتا ہے اور ان کی تشریح بھی اسی انداز میں کرتا ہے۔ اس لیے بعض اوقات توجیہات کا توارد اور تشریحات کی تکرار کا شائبہ ہوتا ہے۔

بچوں کا عالمی سال اختتام کو پہنچ رہا ہے۔ اس مناسبت سے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ علامہ اقبالؒ کی شاعری کے اس پہلو کی طرف اشارہ کیا جائے جو بچوں کی تفریح اور تربیت کے لیے مخصوص ہے۔ علامہ کی افکار کا مقصد معاشرے کی اصلاح اور اسلامی اقدار کا احیاء تھا۔ وہ ایسے فرد کی تکمیل کے آرزومند تھے جس سے زندگی کا پورا انسانی تصور سامنے آجائے۔ چنانچہ اس فلسفہ تعلیم کے پیش نظر انھوں نے بچوں کو مخاطب کیا اور اپنے تخاطب میں ان کی معصوم فطرت اور نفسیاتی ضرورتوں کا لحاظ رکھا۔ ان کے ذوق کی تسلی اور ذہن کی تربیت کے لیے ہلکی پھلکی نظمیں لکھیں اور بعض کہانیوں کو نظم کیا۔ جدت اور تاثیر کی خاطر مختلف مآخذ سے استفادہ کیا۔ ہر نظم میں سبق آموز نتیجہ پیش کرنے کا التزام کیا اور اسے اپنے بیان کی تاثیر سے نقش پذیر دلوں پر مرتسم کر دیا۔ اس طرح بچوں کی دنیا میں اقبالؒ کی شاعری امر ہوگئی۔ مثلاً

ؔ ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے — آتے ہیں جو کام دوسروں کے (ہمدردی)

ؔ نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں — کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

(ایک پہاڑ اور گلہری)

ؔ ان نرم بچھونوں سے خدا مجھ کو بچائے — سو جائے کوئی ان پہ تو پھر اٹھ نہیں سکتا

(ایک مکڑا اور مکھی)

منظومات کے ان نتائج سے ہمدردی، عاجزی اور سادگی ذہن نشین کرانی مقصود ہے۔ اس ضمن میں علامہ کی زندہ جاوید

نظم "بچوں کی دعا" کو ہرگز فراموش نہیں کیا جا سکتا جس کی تاثیر اور مقبولیت بے مثال ہے۔ ہر لب پہ یہ تمنا دعا بن کر آتی ہے کہ:

ہو مرے دم سے یوں ہی میرے وطن کی زینت ۔۔۔ جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

اقبال کے تخلیقی التزام میں بچوں کا اہم مقام ہے۔ وہ اس سطح پر اعلیٰ مفکر اور موثر مبلغ دونوں کے فرائض انجام دیتے ہیں یہ وہ شرف ہے جو اردو زبان میں اقبالؒ کے علاوہ کسی دوسرے شاعر کو ارزاں نہیں ہوا۔ علامہ اقبالؒ مفکر پاکستان ہیں اور پاکستانی قوم فکرِ اقبال کی پروردہ ہے جس پر اردو زبان کی انمٹ چھاپ ہے۔

علامہ اقبالؒ کا ہی تصرف ہے کہ ہم اپنی قومی زبان کی ترویج و اشاعت میں سرگرم ہیں۔ حکومت اور عوام دونوں اس کے قائل اور کوشاں ہیں۔ حکومت پاکستان بھی بے مثال ہیں۔ عوام کی خواہش ہے کہ ہر سطح پر اردو کا رواج عام ہو۔ البتہ اس خواہش کو زیادہ کوشش و عمل میں تبدیل ہونا ہے۔ حکومت پنجاب نے اپنے متعلقہ دفاتر کو حکم نامہ جاری کیا ہے جو تاریخ ساز اور نہایت حوصلہ افزا ہے۔ اس کے اجراء کے بعد قومی زبان کو سرکاری زبان بنانے کی راہ میں شک و تذبذب کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہ حکم نامہ اپنی نوعیت میں عزم و ارادہ کا سنگ میل ہے۔ البتہ دیکھنا یہ ہے کہ گزشتہ دو ماہ میں اس سلسلے میں کتنی پیش رفت ہوئی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ صورتِ حال گورنر صاحب حکومتِ پنجاب کے ملاحظے میں ہو گی۔ محکمے یقیناً قومی شخصیت کو اجاگر کرنے میں زیادہ خلوص و لگن سے کام لیں گے اور حکومت کی تجویز کو عملی جامہ پہنانے میں سبقت لے جائیں گے۔

انجمن ترقی اردو پاکستان ملک کا قدیم ترین ادارہ ہے اور اسے اپنی ذمہ داریوں کا پورا احساس ہے۔ قدیم اور جدید دوسرے اداروں سے اردو کی ترویج و تمول کے لیے تعاون کرنا اس کا وطیرہ ہے۔ انجمن میں حسبِ دستورِ سابق مختلف منصوبوں پر کام ہو رہا ہے۔ گو رفتار سست ہے۔ اس کی ایک وجہ استطاعت کی تنگ دامانی بھی ہے۔ لغات زیرِ طبع ہیں۔ قاموس کی چوتھی جلد زیرِ ترتیب ہے۔ "امہات الکتب" میں کروچے کی اہم تصنیف 'جمالیات' کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اصطلاحات سیاسیات کی طباعت زیرِ غور ہے اور اسی طرح دوسرے کام آگے بڑھ رہے ہیں۔

غرض کہ ہم خاموشی سے حتی الوسع اردو زبان کی ترقی کے کاموں میں لگے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے توفیق استقامت کے لیے دعا گو ہیں۔

گزشتہ دو ماہ سے قومی زبان تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ جس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔ کتابت کی دشواریاں حائل ہیں۔ دوسری مطبوعات کی تکمیل بھی التوا میں ہے۔ اُمید ہے عنقریب صورتِ حال بہتر ہو جائے گی۔ ہم اپنے قارئین سے قومی زبان اور اردو کے لیے مضامین بھیجنے کی بھی استدعا کرتے ہیں۔

مفکرّ و مصوّر پاکستان ڈاکٹر علامّہ محمد اقبالؒ مرحوم تقویم کے آئینہ میں۔

سیّد علی اکبر شاہ کاظمی

آپ بموجب تحقیق سن ہجری کمیٹی و وضاحتی نوٹ منجانب ڈائرکٹر اقبال اکیڈیمی ۹ نومبر ۱۸۷۷ء بمطابق ۳ ذیلقعد ۱۲۹۴ھ بروز جمعتہ المبارک (افق عرب) سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی وطن کشمیر تھا ابتدائی تعلیم آپ نے سیالکوٹ میں ہی حاصل کی۔ یہیں انفیس شمس العلماء مولوی سیّد میر حسن جیسے عربی و فارسی کے ممتاز جیّد عالم کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا۔ آپ نے ۱۸۹۱ء میں مڈل ۱۸۹۳ء میں میٹرک اور بعدہٗ الیف۔ اے کے امتحانات سیالکوٹ ہی میں پاس کیئے۔ اور بی۔ اے کے داخلہ کے لیے لاہور تشریف لاتے آپ نے گورنمنٹ کالج سے بی اے اور ایم۔ اے کے امتحانات بڑے اعزاز کے ساتھ ۲۲ سال کی عمر میں ۱۸۹۹ء میں پاس کیے۔ ۱۹۰۰ء سے ۱۹۰۵ء تک اورنٹل کالج اور گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسری کے فرائض بجالاتے رہے۔ ۱۹۰۵ء میں قانون کی اعلیٰ تعلیم کی خاطر آپ انگلستان گئے یہاں ۱۹۰۸ء تک قیام کیا اور بار ایٹ لاء کی ڈگری ہی حاصل نہ کی بلکہ جرمنی سے پی۔ ایچ۔ ڈی (ڈاکٹر آف فلاسفی) میں نمایاں کامیابی کے بعد وطن عزیز واپس ہوئے۔ ۱۹۰۸ء میں ہی لاہور میں باقاعدہ قانونی پریکٹس شروع کردی۔ ۱۹۱۱ء میں فلسفہ کے پروفیسر بھی مقرر ہو گئے۔ آپ اعلیٰ شخصیت کے مالک بہترین سخن گو اور فقید المثال مفکر تھے۔ علوم اسلامیہ سے پوری طرح آشنا تھے اور عربی و فارسی زبانوں کے ماہر تھے آپ کا کلام فارسی عظمت کی روشن دلیل ہے۔ ہنوز فلسفہ میں آپ کا کوئی ثانی پیدا نہ ہو سکا۔ ۱۹۲۳ء میں خداداد صلاحیتوں کی بناء پر حکومت برطانیہ نے "سر" کے خطاب سے نوازا۔ ۱۹۲۶ء سے آپ کی سیاسی زندگی کا دَور شروع ہوتا ہے۔ ۱۹۲۶ء ہی میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ دوران سیاحت ہند (۱۹۲۸ء تا ۱۹۳۰ء) مختلف مقامات پر آپ نے اسلامی فلاسفی پر نہ صرف لیکچر دیئے بلکہ مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الہ آباد (ہندوستان) میں مسلم قومیت کے پیش نظر "تصورِ پاکستان" کا خاکہ پیش کیا اور یہ پاکستان اُن کے تصور کی روشن تعبیر ہے تحریکِ آزادی کے سلسلے میں ۱۹۳۱ء ۱۹۳۲ء میں

لندن کی گول میز کانفرنسوں میں شریک ہوئے۔ ۱۹۳۳ء میں یورپ کے سفر کے دوران، روم، اسپین بھی گئے۔ ۱۲ر مئی ۱۹۳۶ء کو پنجاب پروونشل مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔ بہترین فکری کارکردگی حسن تدبر، جذبہ ملی اور حب الوطنی کی وجہ سے قوم نے آپ کو ترجمانِ حقیقت" شاعرِ مشرق" "حکیم الامت، مفکر پاکستان" کے خطابات سے نوازا نیز ہندوستان کی اسلامی ریاست بھوپال کی جانب سے تاحیات آپ کو معقول وظیفہ ملتا رہا۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۸ء تک آپ کا مسکن لاہور رہا پھر ریاست بھوپال چلے گئے۔ نواب بھوپال آپ کی نہ صرف قدر کرتے تھے بلکہ بے حد انس رکھتے تھے۔ ۱۹۳۸ء علامہ محترم کی زندگی کا آخری سال تھا۔ آپ نے کم و بیش ۶۱ سال تک ملک و ملت اور اسلام کی خدمت بطرزِ احسن بجالانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا بالآخر ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء مطابق ۲۰ صفر المظفر ۱۳۵۷ھ بروز جمعرات مقدس امانتیں ذمہ داریاں اور احساسات فرض ہمیں ورثہ میں دے کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

مفکر پاکستان ڈاکٹر علامہ محمد اقبال مرحوم کو ہم سے جدا ہوئے تقریباً چالیس برس بیت چکے ہیں قوم خراج عقیدت پیش کررہی ہے ملت اسلامیہ خصوصاً ملت پاکستان پر آپ کے ایسے احسانات ہیں جو ایک زندہ قوم کبھی بھلا نہیں سکتی۔ آپ عظیم شاعر اور فلاسفر تھے۔ فکر و نظر علم و عمل پر مشتمل آپ کا گنجینۂ میراث علم "ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔ آپ میراث میں ہمیں نہ صرف مستحکم پاکستان ہی دیئے گئے ہیں بلکہ استحکام پاکستان یا استحکام ملت اسلامیہ کے لیے درس حریت کے اسباق لازمیہ۔ احساسِ فرض۔ اتحاد۔ اخوت اور مساوات کا تصور امانتاً" دے گئے ہیں جو ناقابلِ فراموش ہیں۔

تحقیق یوم ولادت و یوم وفات تقویمی حسابات کی روشنی میں پیش خدمت کرنے کی جسارت کر رہا ہوں امید ہے قارئین محترم اعمال تقویم شمسی عیسوی و تقویم قمری ہجری سے حتی المقدور مستفید ہوں گے۔ قبل از حسابات تقویم شمسی عیسوی و قمری ہجری رائج الوقت ڈائریکٹر اقبال اکیڈمی کے افکار جو موصوف نے بسلسلہ یوم ولادت و یوم وفات علامہ مرحوم اخبار جنگ راولپنڈی ۹ نومبر ۱۹۷۴ء میں بیان فرمائے ہیں۔ پہلے ان کا درج کرنا مناسب ہے۔

علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش کا مسئلہ متنازعہ تھا علامہ کی سوانح حیات لکھنے والوں نے مختلف تاریخیں درج کی ہیں اس سلسلے میں پراگ (چیکوسلواکیہ) کے اردو پروفیسر" یان مارک" نے ۱۹۵۸ء میں ایک مقالہ لکھا تھا اور "روزگار فقیر" کے مصنف فقیر سید وحید الدین اور بشیر عبد الواحد صاحب نے اپنی انگریزی کتاب "THOUGHT AND REFLECTIONS OF IQBAL" میں اس مسئلے پر مدلل بحث کی تھی۔ علاوہ ازیں علامہ کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد اور دوسرے اصحاب قلم نے بھی مضامین لکھے ہیں جن سے قطعی تاریخ کا فیصلہ ناممکن تھا۔ لہذا اس خلط مبحث کو دور کرنے کے لیے حکومت نے ایک اعلیٰ سطحی کمیٹی بنائی تھی جس نے علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش ۹ نومبر ۱۸۷۷ء قرار دی ہے اور اب یوم ولادت اقبال کی تقریب ہر سال ۹ نومبر ہی کو منعقد ہوگی علامہ اقبال نے اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے:

"THE DEVELOPMENT OF META-PHYSICS IN PERSIA"

"میں تیسری ذیقعد ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۶ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوا تھا"

یہ سن ہجری کمیٹی کی طے کردہ تاریخ کے مطابق ۹ر نومبر ۱۸۷۷ء ہے چونکہ اب تک یوم اقبال ہر سال ۲۱ اپریل کو منایا

جاتا رہا ہے اور اس تاریخ کی خاص اہمیت ہے کیونکہ یہی تاریخ ہے جس دن یہ "دانائے راز" ہم سے ہمیشہ کے لیئے جدا ہوگیا تھا اور اس کی یاد میں اس دن "یوم وفات" مناکر ہم شاعر مشرق کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

(الف) یوم وفات علامہ محمد اقبال مرحوم "زائج الوقت شمسی حسابات تقویم کے بعد مطابق ۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء

استخراج تاریخ قمری ۔ دن ۔ ماہ و سن ہجری رائج الوقت

حل طلب شمسی مدت = ۱۹۳۷ سال ۳ ماہ اور ۲۱ دن

		دن	ہفتے
۱۹۰۰ شمسی سالوں کے ہفتے اور دن	=	۱	۹۹۱۳۷
۳۷ " " "	=	۴	۱۹۳۰
۱۹۳۸ء کے ۳ ماہ "	=	۶	۱۲
۱۹۳۸ء کے ماہ اپریل کے ۲۱ دن	=	۰	۳
کل مدت یکم جنوری ۱ء تا ۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء	=	۴	۱۰۱۰۸۳

مکمل ہفتوں سے زائد (۴) دن ہیں آغاز سن شمسی عیسوی تقویم سوموار سے ہوا تھا مطابق ۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء مکمل ہفتوں سے زائد چوتھا دن بموجب قاعدہ تقویم جمعرات کا دن استخراج ہوتا ہے جو صحیح ہے۔

قمری حسابات تقویم رائج الوقت کے لیے کل شمسی عیسوی مدت میں سے مدت قبل آغاز سن ہجری ۳۲۴۳۰ ہفتے ۶ دن منفی کرنے کے بعد بقیہ مدت تا ۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء قمری سالوں ۔ مہینوں اور دنوں کی ہے استخراج سن ہجری ماہ و تاریخ کے لیے عمل پیش خدمت ہے :۔

		دن		ہفتے	
یکم جنوری ۱ء تا ۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء تک کل مدت	=	۴	-	۱۰۱۰۸۳	
مدت قبل آغاز سن ہجری (بلحاظ آغاز ایت وار)	=	۶	-	۳۲۴۳۰	منفی کریں
قمری مدت یکم محرم ۱ھ تا ۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء	=	۵	-	۶۸۶۵۲	

قمری مدت معلومہ میں مکمل ہفتوں سے (۵) دن زائد ہیں آغاز سن ہجری اتوار سے افق پاکستان ہے۔ بموجب قاعدہ تقویم اتوار سے پانچواں دن جمعرات کا ملا جو بلحاظ مطابقت مدت شمسی صحیح ہے۔ قمری سنین ماہ و روز۔ تاریخ کے لیے :۔

	ہفتے	دن	گھنٹے	منٹ	
حل طلب قمری مدت	۶۸۶۵۲	۵	۰	۰	
۱۳۰۰ قمری سالوں کے ہفتے دن گھنٹے اور منٹ =	۶۵۸۱۰	۴	۲۲	۲۳	منفی کریں
=	۲۸۴۲	۰	۰	۲۷	
۵۶ قمری سالوں کے " " " =	۲۸۲۴	۶	۱۰	۲	منفی کریں
=	۷	۰	۱۳	۳۵	
۱۳۵۷ھ کے ۱ ماہ کے " " " =	۴	۱	۱۲	۴۳	منفی کریں
باقی ۲ ہفتے ۶ دن یا ۲۰ دن ۱۳۵۷ھ =	۲	۶	۰	۵۲	باقی

کے دوسرے ماہ کے لیں پس حساباً و مطابقاً ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء مطابق ۲۰ صفر المظفر ۱۳۵۷ھ بروز جمعرات بلحاظ تحقیق یوم وفات علامہ محمد اقبال مرحوم صحیح ہے۔

نوٹ: اگر اتوار سے یوم آغاز سن ہجری تسلیم کریں تو مدت قبل آغاز سن ہجری یکم جنوری سنہ ۱ء سے ۳۲۴۳۰ ہفتے اور ۶ دن ہوتی ہے اور مقدار سال قمری۔

۳۵۴ دن ۸ گھنٹے ۴۸ منٹ اور ۵۱ء ۷ سیکنڈ ہوتی ہے (بجناب سلمان محققین

اور آغاز سن ہجری یکم محرم الحرام سنہ ۱ھ مطابق ۲۱ جولائی ۶۲۲ء استخراج ہوتا ہے۔ { ولید حسین رضوی صاحب)

بحوالہ روزنامہ حریت کراچی)

(الف) ۱ے میں حسابات بلحاظ آغاز سن ہجری اتوار افق پاکستان لیں

۲ے حسابات بلحاظ آغاز سن ہجری جمعۃ المبارک افق پاکستان ۲ے میں ملاحظہ فرمائیں

نوٹ: اگر جمعہ سے یوم آغاز سن ہجری تسلیم کریں تو مدت قبل آغاز سن ہجری ۳۲۴۳۰ ہفتے اور ۴ دن یکم جنوری سنہ ۱ء سے ہوتی ہے اور مقدار سال قمری۔

۳۵۴ دن - ۸ گھنٹے - ۴۸ منٹ ۳۴۴۶۴۴ سیکنڈ ہوتی ہے (بموجب گرین وچ المانک)

آغاز سن ہجری یکم محرم الحرام سنہ ۱ھ مطابق ۱۹ جولائی ۶۲۲ء استخراج ہوتا ہے۔

بموجب حسابات قمری بلحاظ آغاز سن ہجری جمعہ سے جب کہ مدت قبل ہجرت ۲۲۴۳۰ ہفتے ۴ دن ہے

		دن	ہفتے
یکم جنوری سنہ ۱ء تا ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کل مدت	=	۴	۱۰۱۰۸۳
مدت قبل آغاز سن ہجری	=	۴	۲۲۴۳۰ منفی کریں
قمری معلومہ مدت یکم محرم سنہ ۱ھ تا ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء	=	۰	۶۸۶۵۳

قمری معلومہ مدت مکمل ہفتوں میں ہے۔ یکم محرم الحرام سنہ ۱ھ کا آغاز جمعہ کے دن سے مانا جاتا ہے۔ تکمیل ایام ہفتہ جمعرات کے دن پر ہوتی ہے بموجب قاعدہ تقویم جمعہ سے ساتواں دن یا مکمل ہفتہ جمعرات کا دن استخراج ہوتا ہے لہذا ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو جمعرات کا دن صحیح ہے۔ قمری مدت سے قمری سنین ماہ و روز اور تاریخ کے لیے عمل ملاحظہ فرمائیں۔

		منٹ	گھنٹے	دن	ہفتے	
حل طلب قمری مدت	=	۰	۰	۰	۶۸۶۵۳	
۱۳۰۰ قمری سالوں کے ہفتے دن گھنٹے اور منٹ	=	۲۶	۴	۰	۶۵۸۱۱	منفی کریں
	=	۳۴	۱۹	۶	۲۸۴۱	
۵۶ قمری سالوں کے ” ” ” ” ”	=	۲۰	۱۳	۶	۲۸۲۴	منفی کریں
	=	۱۴	۶	۰	۱۷	
۱۳۵۷ھ کے (۱) ماہ کے ” ” ” ” ”	=	۴۴	۱۲	۱	۴	
باقی ۲ ہفتے ۵ دن یعنی ۱۹ دن ۱۷ گھنٹے		۳۰	۱۷	۵	۲ یا	
۱۳۵۷ھ کے دوسرے ماہ کے پس۔ گھنٹوں		۰	۰	۶	۲ یا ۲۰ دن	

گھنٹوں کی کسر نصف دن سے زائد ہے

پورے دن میں شمار ہوگی پس ۲۰ دن ہوئے لہذا ۲۰ صفر المظفر ۱۳۵۷ھ بمطابق ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء جمعرات کا دن حساباً بلحاظ یوم وفات علامہ محمد اقبال مرحوم صحیح ہے۔

نوٹ: یوم وفات پر شمسی و قمری تاریخوں میں بلحاظ دن مطابقت صحیح ہے اور مطابق افق پاکستان ہے مگر یوم ولادت میں سن ہجری کمیٹی کی جانب سے مجوزہ تاریخ اور دن میں ایک ایک دن اور تاریخ میں حساباً اختلاف ہے۔ عمل یوم وفات کے مطابق ہی عمل یوم ولادت کیا گیا ہے بلحاظ افق پاکستان ایک دن کا فرق توجہ خصوصی کا متحق ہے۔

(ب) یوم ولادت علامہ محمد اقبال مرحوم مروجہ قمری حسابات تقویم سے شمسی عیسوی حسابات تقویم رائج الوقت میں

۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ مطابق ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کا تقویمی جائزہ

۱؎ بموجب حسابات قمری گردش (الف) ۱؎

حل طلب قمری مدت = ۱۲۹۳ سال ۱۰ ماہ اور ۳ دن

	منٹ	گھنٹے	دن	ہفتے
۱۲۰۰ قمری سالوں کے ہفتے دن گھنٹے اور منٹ =	۳۱	۱۰	۲	۶۰۷۴۸
۹۳ " " " " " =	۲۹	۲۲	۶	۴۷۰۷
۱۲۹۴ھ کے ۱۰ ماہ کے " " " " =	۱۸	۷	۱	۴۲
۱۲۹۴ھ کے ماہ ذیقعد کے ۳ دن	۰	—	۳	—
یکم محرم ۱ھ تا ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ کل مدت	۱۸	۱۷	۶	۶۵۴۹۸ یا
	۰	—	۰	۶۵۴۹۹

بمطابق ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ مکمل ہفتوں سے کم یا زائد دن نہیں ہے آغاز یکم محرم ۱ھ ایت وار سے ہوا پس ہفتہ کا آخری دن ہفتہ مطابق ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ بموجب حسابات تقویم صحیح ہے۔

۲؎ بموجب حسابات قمری گردش (الف) ۲؎

حل طلب قمری مدت = ۱۲۹۳ سال ۱۰ ماہ اور ۳ دن

	منٹ	گھنٹے	دن	ہفتے
۱۲۰۰ قمری سالوں کے ہفتے دن گھنٹے اور منٹ =	۲۹	۱۱	۴	۶۰۷۴۸
۹۳ " " " " " " =	۱۷	۳	۰	۴۷۰۸
۱۲۹۴ھ کے ۱۰ ماہ کے " " " =	۲۰	۷	۱	۴۲
۱۲۹۴ھ کے ماہ ذیلقعد کے ۳ دن =	۰	۰	۳	۰
یکم محرم ۱ھ تا ۳ ذیلقعد ۱۲۹۴ھ =	۰۶	۲۲	۱	۶۵۴۹۹ یا
کل مدت =	۰	۰	۲	۶۵۴۹۹

معلومہ مدت قمری میں مکمل ہفتوں سے (۲) دن زائد ہیں۔ یکم محرم ۱ھ کا آغاز جمعہ کے دن سے ہوا پس جمعہ سے دوسرا دن بموجب قاعدہ تقویم ہفتہ مطابق ۳ ذیلقعد ۱۲۹۴ھ حسابات تقویم کے عین مطابق ہے۔

نوٹ: مندرجہ بالا ہر دو حسابات میں اگر ماہ ذیلقعد کی ۲ تاریخ ہوتی تو جمعہ کا دن بمطابق ۹ نومبر ۱۸۷۷ء صحیح ہوتا علامہ محترم کی اپنی تحریر سے واضح ہے کہ آپ کی پیدائش (۳) ذیلقعد ۱۲۹۴ھ کو ہوئی تھی تو افق پاکستان کے مطابق ۳ ذیلقعد ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۰ نومبر ۱۸۷۷ء بروز ہفتہ صحیح تاریخ پیدائش ہوگی۔

قمری مدت معلومہ کی روشنی میں شمسی عیسوی لحاظ سے اخراج دن

دن - ہفتے　　مدت قبل ہجرت ہفتے　　دن - کل مدت

ب ۱ھ میں قمری مدت = ۰ - ۶۵۴۹۹ + ۶ - ۲۲۴۳۰ (۶) - ۹۷۹۲۹ ہفتے

ب ۲ھ میں قمری مدت = دن - ہفتے　دن - ہفتے =

۲ - ۶۵۴۹۹ + ۴ - ۲۲۴۳۰ = (۶) - ۹۷۹۲۹ ہفتے

مندرجہ بالا ہر دو حسابات قمری میں مدت قبل آغاز سن ہجری جمع کریں تو مکمل ہفتوں سے زائد (۶) دن ہوتے ہیں۔ یکم جنوری ۱ء کا آغاز سوموار سے ہوا تھا۔ یکم جنوری ۱ء تا ۳ ذیلقعد ۱۲۹۴ھ کل مدت میں آخری دن بموجب قاعدہ تقویم ہفتہ کا ثابت ہوتا ہے جو بلحاظ افق پاکستان صحیح ہے۔ کل شمسی مع قمری مدت سے سنین شمسی عیسوی ماہ دن اور تاریخ کے لیے عمل پیش خدمت ہے:

		دن	ہفتے	
یکم جنوری سنہ ۱ء تا ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ حل طلب شمسی مدت	=	۲ -	۹۷۹۲۹	
۱۸۰۰ شمسی سالوں کے ہفتے اور دن	=	۳ -	۹۳۹۱۹	منفی کریں
۷۶ شمسی سالوں کے ہفتے اور دن	=	۳ -	۴۰۱۰	
	=	۴ -	۳۹۶۵	منفی کریں
	=	۶ -	۴۴	
۱۸۷۷ء کے ۱۰ ماہ کے ہفتے اور دن	=	۳ -	۴۳	منفی کریں
باقی ۱۰ دن ماہ نومبر ۱۸۷۷ء کے میں	=	۳ -	۱	یا ۱۰ دن

حساباً ثابت ہوا کہ ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ افق پاکستان مطابق ۱۰ نومبر ۱۸۷۷ء کو ہفتہ کا دن تھا اور بلحاظ افق عرب ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ مطابق ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو جمعۃ المبارک تھا۔ سن ہجری کمیٹی برائے تحقیق یوم پیدائش علامہ محمد اقبال مرحوم کے حسابات میں ایک دن کا اشتباہ ضرور ہے۔ کمیٹی کی جانب سے اتخراج کردہ تاریخ شمسی حساباً بلحاظ افق عرب معلوم ہوتی ہے۔ یا پھر بجائے (۳) ذیقعد کے (۲) ذیقعد کا حساب کر لیا گیا جس سے ۹ نومبر ۱۸۷۷ء بروز جمعہ اتخراج ہو گیا بلحاظ افق پاکستان علامہ محترم کا یوم ولادت و تاریخ ولادت کے حسابات پر نظر ثانی درکار ہے۔ حسابات گردش قمری مروجہ کے تحت آپ کا یوم ولادت ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۰ نومبر ۱۸۷۷ء صحیح اتخراج ہوتا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ارباب اختیار و اراکان سن ہجری کمیٹی نے صرف کتاب "تقویم تاریخی" مرتبہ مولانا عبدالقدوس صاحب ہاشمی مطبوعہ مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی کراچی سے استفادہ فرمایا ہے۔ تقویم تاریخی میں یکم ذیقعد ۱۲۹۴ھ مطابق ۷ نومبر ۱۸۷۷ء بدھوار کا دن تھا۔ ظاہر ہے کہ ۳ ذیقعد کو جمعہ مطابق ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہوا۔ ماسوائے اس کتاب کے دیگر کسی حساب قمری سے ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ مطابق ۹ نومبر ۱۸۷۷ء جمعہ کا دن ثابت نہیں ہوتا۔

(ح) حیات مبارکہ "مفکر پاکستان" ڈاکٹر علامہ محمد اقبال مرحوم

		دن	ہفتے
یکم جنوری سنہ ۱ء تا ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء بلحاظ یوم وفات کل مدت	=	۴ -	۱۰۱۰۸۳
یکم جنوری سنہ ۱ء تا ۱۰ نومبر ۱۸۷۷ء بلحاظ یوم ولادت کل مدت	=	۵ -	۹۷۹۲۹
کل حیات مبارکہ		۶ دن -	۳۱۵۳ یا
		۷۷ -	۲۲۰ دن

۱۔ حیات شمسی حسابات میں :۔

		دن	-	ہفتے	
حل طلب مدّت	=	۶	-	۳۱۵۳	
۶۰ سالوں کے ہفتے اور دن	=	۵	-	۳۱۳۰	منفی کریں
		۱	-	۲۳	
۶۱ ویں سال کے ۵ ماہ کے ہفتے اور دن	=	۴	-	۲۱	منفی کریں
باقی ۱۱ دن چھٹے ماہ کے ہیں	=	۴	-	۱	یا ۱۱ دن

شمسی حسابات میں آپ نے ۶۰ سال ۔ ۵ ماہ اور ۱۱ دن بشمول یوم ولادت و یوم وفات عمر مبارک پائی

حیات قمری حسابات میں :۔

		دن	-	ہفتے	
حل طلب مدت	=	۶	-	۳۱۵۳	
۶۰ قمری سالوں کے ہفتے اور دن	=	۲	-	۳۰۳۷	منفی کریں
	=	۳	-	۱۱۶	
۲ قمری سالوں کے ہفتے اور دن	=	۲	-	۱۰۱	منفی کریں
	=	۱	-	۱۵	
۶۳ ویں سال کے ۳ ماہ کے ہفتے اور دن	=	۵	-	۱۲	منفی کریں
باقی ۱۷ دن چوتھے ماہ کے ہیں	=	۳	-	۲	یا ۱۷ دن

قمری حسابات میں آپ نے ۶۲ سال ۔ ۳ ماہ اور ۱۷ دن بشمول یوم ولادت و یوم وفات

عمر مبارک پائی

(د) آخر میں مختصر کوائف بابت حیات مبارکہ مفکر پاکستان علامہ ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم پیش خدمت ہیں:

یوم ولادت

۳ - ذلیقعد ۱۲۹۴ھ　بروز ہفتہ
۱۰ - نومبر ۱۸۷۷ء　بروز ہفتہ
} افق پاکستان

یا

۳ - ذلیقعد ۱۲۹۴ھ　بروز جمعہ
۹ - نومبر ۱۸۷۷ء　بروز جمعہ
} افق عرب ؟

قمری حسابات کی روشنی میں ۱۰ نومبر یا ۹ نومبر قابل نظر ثانی ہیں۔

یوم وفات

۲۰ صفر المظفر ۱۳۵۷ھ　بروز جمعرات
۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء　بروز جمعرات
} افق پاکستان

(ھ) مدت حیات اقدس

عمر مبارک شمسی سالوں میں = ۶۰ سال - ۵ ماہ اور ۱۱ دن
〃 قمری سالوں میں = ۶۲ سال - ۳ ماہ اور ۱۷ دن
〃 ہفتوں اور دنوں میں = ۳۱۵۲ ہفتے اور ۶ دن
〃 دنوں میں = ۲۲۰۷۷ دن

انجمن ترقی اردو پاکستان کی شائع کردہ

اردو کی منظوم داستانیں

تحریر: ڈاکٹر فرمان فتحپوری

قیمت : ۲۵ روپے

اقبالؔ اور یارانِ اقبالؔ

ڈاکٹر آفتاب احمد ردولوی

علامہ اقبال کو یارانِ اقبال (ہم) نے چند مستثنیات کو چھوڑ کر جی بھر کے قدم قدم پر، طرح طرح سے، کبھی ہٹ کے کبھی مسلسل، مختلف طریقوں اور زاویوں سے تختۂ مشق بنا رکھا ہے بنا رہے ہیں، بنا چکے ہیں اور آثار کچھ ایسے ہیں کہ آئندہ بھی اپنی ان حرکتوں سے باز نہ آئیں گے وجہ اس کی یہ ہے کہ اپنی دانشوری کا سکہ کچھ اسی طرح بیٹھتا اور خود نمائی کا موقع ملتا ہے۔

اقبال پڑھے گئے، پڑھائے گئے، ان پر لکھا گیا، لکھایا گیا۔ ان کے کلام کو گایا گیا، گنگنایا گیا، گلی گلی اور کوچہ کوچہ میں، ریڈیائی لہروں اور ٹیلیویژن کے اسکرینوں پر، مگر یہ توفیق دو چار کو چھوڑ کر کسی کو بھی نہ ہوئی، کہ ان کے فرمودات پر عمل کرنا تو الگ رہا، سمجھنے کی طرح سمجھنے کی کوشش کرتا۔

اقبال کے کلام و پیام کی تشریحیں، تفسیریں اور "افرنگ زدہ" دانشوروں کی ان پر سبق و عبرت آموز تحریریں پڑھیں، سنیں، دیکھیں اور اب خدا کے فضل سے ان کے فارسی کلام کے اردو منظوم ترجمہ سے بھی لطف اندوز ہونے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے، پھر بھی یہ کہے بغیر:

شرح او کردند و او را کس نہ دید	معنیٔ او چوں غزال از ما رمید
"رقصِ تن" از حرفِ او آموختند	چشم را از "رقصِ جاں" بر دوختند[1]

رہا نہیں جاتا۔

جانتا ہوں کہ یہ دور (SPECIALISATION) کا دور ہے۔ اس میں اعضا ٹٹولے جاتے ہیں یا صرف "جزو" سے بحث ہوتی اور کی جاتی ہے "کل" سے سروکار یا واسطہ کم ہی رکھا جاتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا صحیح نتیجے پر پہنچنے اور فیصلہ صادر کرنے سے پہلے "کل" سے بے نیازی برتنا یا اسے اعتنا کے قابل نہ سمجھنا مناسب ہے؟

کاش اقبال کے "رقصِ تن" سے لطف اندوز ہونے والی نگاہیں، ایک نظر اس کے "رقصِ جاں" پر بھی ڈال سکنے کی ہمت کر سکتیں رقصِ جاں، جس کے کیف سے فیض اٹھانے کی صلاحیت سے فرنگ، افرنگ یا کلیسا اور ان کی تقلید میں ہم یکسر محروم ہو چکے ہیں۔

میں یہ بھی دیکھوں گا کہ ہمارے یہ محققین جو کہتے یا لکھتے ہیں اس میں وزن، وقار اور سچائی نہیں ہوتی، ہوتی ہے اور ضرور ہوتی ہے مگر یہ سچائی بیشتر ان اندھوں کی جیسی ہوتی ہے جنہوں نے ہاتھی کے پاؤں، سونڈ، دم اور پیٹ کے بارے میں ٹٹول ٹٹول کر جو کچھ کہا بالکل صحیح

[1] پس چہ باید کرد صفحہ ۲۰۸

کہا مگر ہاتھی بے چارہ کہیں کا نہ رہا۔ کیا یہی حال ہمارے ہاتھوں، ان دنوں اقبال کا نہیں ہو رہا ہے؟

پھر کس برتے پر کہا جا سکتا ہے، کہ اقبال کی الجھی کی وہم سے یہ اور اس قسم کی شکایتیں:۔

همه گفتند با ما آشنا بود　　چو رخت خویش بربستم ازیں خاک
چه گفت و با که گفت و از کجا بود　　ولیکن کس نه دانست ایں مسافر

"آشکارم" "دیدو" "پنهانم" نه دید　　کم نظر "بیتابی جانم" نه دید

نا روا یا بے جا ہیں۔

اقبال کسی اور مٹی کے بنے تھے۔ اس سے میری مراد افلاطونی قسم کی مٹی سے نہیں بلکہ یہ ہے کہ وہ "زرخیز" تھی اور شاید اسی وجہ سے زرخیز بھی، ہماری مٹی کچھ "سیم اور تھور" قسم کی ہے جسے کار آمد بنانے کی دھن میں "مغربی کھاد" کا استعمال اتنا اندھا دھند ہوا کہ کھاد ہی کھاد رہ گئی اور مٹی غائب۔ نتیجہ آنکھ کے سامنے ہے۔

اقبال نے مغرب سے بہت کچھ سیکھا اور چونکہ آنکھیں کھول کر سیکھا اس لئے اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا اور پہنچانے کی بھی سر توڑ کوشش کی۔ ہمیں چونکہ سیکھنے کے لئے اقبال سے کہیں زیادہ سہولتیں اور مواقع حاصل تھے۔ اس لئے سیکھ تو ہم جانے کیا کیا لیا۔ مگر اس "سیکھ" سے فائدہ اٹھانا تو الگ رہا، جو گرہ میں تھا اسے بھی گنوا دیا۔ کاش ہم "استفادے" اور "تقلید" کے فرق و فاصلے کو محسوس کر سکتے۔

"تقلید" بے سمجھے بوجھے "اندھا دھند پیروی" کا نام ہے مگر "استفادے" کے مطالبات کچھ اور ہی ہیں۔ اوّل الذکر میں اچھے برے نیک و بد، جائز و ناجائز اور حرام و حلال کے ظرفے نہیں پائے جاتے، اس کی سراج ترکیب "سٹھو بیٹا" بن جانے میں ہے۔ اس کے علمبردار تنقید کے تیر باراں سے بچنے کے لئے شریف النفس حالی کے کبھی اس مشورے کو:۔

بس اقتدائے مصحفی و میرؔ ہو چکی　　حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں

اپنا سپر تو ضرور بنا لیتے ہیں مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ مشورہ کب، کس وجہ، اور کتنے پر آشوب دور میں دیا گیا تھا وہ محکومی، غلامی اور دار و گیر کا دور تھا۔ اس لئے "حربا تیں سلطنت اور کشور کشائی کے لئے ضروری ہوتی ہیں" ان کی واقعی اس وقت ضرورت نہ تھی۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا وہ ضرورت اب بھی باقی ہے؟ پھر:۔

ایسی یہ تپ چڑھی ہے کہ چہرے اتر گئے　　تہذیب مغربی میں ہیں سب کے حواس گم　　(اکبر الہ آبادی)

کا کیا جواز ہے۔

برخلاف اس کے "استفادہ" کسب کے دوران میں "تنقید" کو ہمیشہ مقدم رکھتا ہے۔ اور کسی چیز کو قبول یا رد کرنے کے لئے "خذ ما صفا ودع ما کدر" کو اپنا معیار قرار دیتا ہے۔

قبول و رد کا یہی معیار اقبال کا بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر چمکدار چیز کو نہ تو "سونا" کہہ سکے اور نہ تقلید مغرب کو ہم جیسے "انحطاط

ا؎ ارمغان حجاز: ۱۳۶

خورشی "کو" تہذیب " کا خوش نما نام دے کر اترانے والوں کی طرح فلاح و نجات کا واحد ذریعہ سمجھنے پر آمادہ ہوتے۔ اس سے انہیں یہ نقصان تو ضرور پہنچا کر "احساس کمتری" کا جو طرۂ امتیاز انعام کے طور پر ہمیں ملا ہے وہ اس سے محروم رہے۔ پھر بھی وہ گھاٹے میں نہیں رہے کیونکہ اسی "محرومی" نے انہیں خودشناسی، خودآگاہی[۱] اور خودداری کی قدر و قیمت بتاکر، خوداعتمادی کی راہ دکھائی جس پر چل کر وہ نہ صرف[۲] خودی کا اپنا فلسفہ پیش کر سکے بلکہ سر اٹھا کر بہ بانگ دہل یہ اعلان بھی کر سکے:۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید   نسیمے از حجاز آید کہ ناید[۳]

دوسری طرف ہم، ہمارے ادیب، شعراء، خصوصاً نقاد اور دوسرے فن کاروں کا حال یہ ہے کہ جو کہتے یا لکھتے ہیں اس کی صحت پر خود ان کو اس وقت تک اعتماد و اعتبار نہیں ہوتا، جب تک کسی پیرِ مغرب کا سہارا نہ مل جائے۔

ہمارے مغرب زدہ دانشوروں اور اقبال کی "فکر" میں تضاد کی حد تک جو فرق ہے اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ جہاں ہم نے ہاتھ باندھ اور سر جھکا کر مغرب، فرنگ، یا افرنگ کے دربار میں چاندی دی۔ اقبال نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کو دیکھا ہی نہیں پرکھا بھی ہے۔ ضروری نہیں اس پارکھ کی پرکھ کے نتائج سے ہم مطمئن ہو جائیں اور انہیں آنکھیں بند کر کے قبول کر لیں۔ پھر بھی ایک نظر انھیں دیکھ لینے میں ہرج کیا ہے۔

آئیے بسم اللہ

قدح خرد فروزے کہ فرنگ داد مارا   ہمہ آفتاب لیکن اثرِ سحر ندارد[۴]

فرنگ گرچہ سخن با ستارہ می گوید   حذر کہ شیوۂ او رنگِ جوزنی دارد[۵]

یکے بنگر فرنگی کج کلاہاں   تو گوئی آفتابانند در باہاں
جہانِ سادہ می گرم خون است   نگہدارش ازیں کافر نگاہاں[۶]

ایں خراباتِ فرنگ است و ز تاثیر میش   آنچہ مذموم شمارند نماید محمودہ[۷]

۱۔ اختلاط جویش را تہذیب گفت (اقبال) اسرار خودی صـ (۳) ارمغانِ حجاز صفحہ ۱۸۳
۲۔ نظریہ جویش جہاں بتہ ام کہ جلوۂ دوست   جہاں گرفت مرا فرصت تماشا نیست (کلیات اقبال فارسی) صـ
۳۔ ارمغان حجاز صفحہ ۱۸۳
۴۔ زبورِ عجم
۵۔ پیام مشرق صـ ۱۵۳
۶۔ ارمغان حجاز
۷۔ کلیات اقبال (فارسی) صفحہ ۲۸۲

مے از میخانۂ مغرب چشیدم بجانِ من کہ دردِ سر خریدم
نشستم با نکویانِ فرنگی از آں بے سوز تر چیزے ندیدم [۸]

تیرے پیمانوں سے یہ ہے اے مئے مغرب اثر خندہ زن ساقی ہے ساری انجمن مدہوش ہے [۹]

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے [۱۰]

مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق طبِ مغرب کے مزے میٹھے اثر خواب آوری [۱۱]

بہ افرنگی بتاں دل باختم من ز تابِ دیریاں بگداختم من
چناں از خویشتن بیگانہ بودم چو دیدم خویش را نشناختم من [۱۲]
ز سیناے کہ خوردم در فرنگ اندیشہ تاریک است سفر در زیدہ خود را نگاہ راہ بینے دہ [۱۳]

گرچہ دارد شیوہ ہائے رنگ رنگ من بجز عبرت ندیدم از فرنگ [۱۴]

اور پھر چیخ اٹھتے ہیں :-

اے بہ تقلیدش اسیر آزاد شو دامنِ قرآں بگیر آزاد شو [۱۵]

در گذر از جلوہ ہائے رنگ رنگ خویش را دریاب از ترکِ فرنگ [۱۶]

---

۸ ارمغان حجاز صفحہ ۲۷
۹ بانگ درا صفحہ ۲۷۵
۱۰ بانگ درا صفحہ ۲۷۳
۱۱ بانگ درا صفحہ ۲۶۱
۱۲ ارمغان حجاز صفحہ ۷۸
۱۳ زبور عجم صفحہ ۳۰
۱۴، ۱۵ جاوید نامہ صفحہ ۷۲
۱۶ جاوید نامہ صفحہ ۷۸

ما ہمہ افسونیٔ تہذیب غرب کشتۂ افرنگیاں بے حرب و ضرب [17]

اقبال کی مغرب، فرنگ، افرنگ یا کلیسا سے یہ بیزاری بے جا یا بلاوجہ نہیں۔ بیزاری کی ان کے پاس ایک دو نہیں متعدد وجوہ ہیں، ٹھوس، مضبوط اور پہاڑ کی طرح مستحکم :۔

"تفریق ملل" حکمت افرنگ کا مقصود اسلام کا مقصود فقط ملت آدم [18]

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف [19]

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف [20]

نگر فرنگ بہ پیش مجاز آورد سجود بینائے کور و مست تماشائے رنگ و بوست [21]
گردندہ تر ز چرخ و ربایندہ تر ز مرگ از دست او بدامن ما چاک بے رفوست

مکدر کرد مغرب چشمہ ہائے علم و عرفاں را جہاں را تیرہ تر سازد چہ مشائی چہ اشراقی [22]

دانش مغربیاں، فلسفۂ مشرقیاں ہمہ بتخانہ و در طوف بتاں چیزے نیست [23]

ز علم و دانش مغرب ہمیں قدر گویم خوش است آہ و فغاں تا نگاہ ناکام است [24]

اور جب وہ یہ قیامت دیکھتے ہیں :۔

مومن از افرنگیاں دید آنچہ دید فتنہ ہا اندر حرم آمد پدید [25]

۱۷ پیش چہ باید کرد صفحہ ۵
۱۸ ضرب کلیم صفحہ ۵۸
۱۹ ضرب کلیم صفحہ ۸۶
۲۰ ضرب کلیم صفحہ ۷۱
۲۱ زبور عجم صفحہ ۴۹
۲۲ زبور عجم صفحہ ۲۸ ۲۳ جاوید نامہ صفحہ ۴۶ ۲۴ زبور عجم صفحہ ۲۶ ۲۵ کلیات اقبال فارسی صفحہ ۸۶۳

تو صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے، قوتِ برداشت جواب دے جاتی ہے اور بے اختیار منہ سے نکل جاتا ہے :۔

فریاد ز افرنگ و دلآویزیٔ افرنگ — فریاد ز شیرینی و پرویزیٔ افرنگ

عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ [۲۶]

چنگیزیٔ افرنگ، ہمارے لئے دورِ غلامی میں بھی سب سے بڑا فتنہ تھا اور آج بھی ہے۔ اسی فتنہ کی تباہ کاریوں کا جان لیوا احساس ہی تھا جو فریاد کی صورت میں اس طرح، اقبال کی نوکِ زبان پر آیا ہے۔

شہسوارا یک نفس درکش عناں — حرف من آساں نیاید بر زباں

گرد تو گردد حریمِ کائنات — از تو خواہم یک نگاہِ التفات

ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی — کشتی و دریا و طوفانم توئی

آہوے زار و زبون و ناتواں — کس بہ فتراکم نہ بست اندر جہاں

اے پناہ من حریم کوے تو — من بہ امیدے رمیدم سوے تو [۲۷]

اے وجود تو جہاں را نوبہار [۲۸] — پرتو خود را دریغ از من مدار

ایک طرف تو یہ فریاد ہے اور دوسری طرف قدم قدم پر ہم سے یہ درخواست [جسے میں مشورہ اور صاحبانِ نظر (دانشور نہیں) سرزنش سمجھے بغیر نہ رہ سکیں گے] :۔

گرچہ ہے دلکش بہت حسنِ فرنگ کی بہار — طائرکِ بلند بام، دانہ و دام سے گزر [۲۹]

کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ — بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ [۳۰]

سجودے آوری دارا و جم را — مکن اے بے خبر رسوا حرم را

مبر پیش فرنگی حاجتِ خویش — ز طاق دل فرو ریزم ایں صنم را [۳۱]

---

۲۶ زبورِ عجم ص ۸۳

۲۷ پس چہ باید کرد ص ۵۰

۲۸ پس چہ باید کرد ص ۵۱

۲۹ بالِ جبریل ص ۲۹

۳۰ بالِ جبریل ص ۷۶

۳۱ ارمغانِ حجاز ص ۱۳۹

بہ افرنگی بتاں خود را سپردی　　چہ نامردانہ در بتخانہ مردی
خرد بیگانۂ دل، سینہ بے سوز　　کہ از تاک نیاگاں مے نہ خوردی [۳۲]

معمار حرم باز بہ تعمیر حرم خیز　　از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز [۳۳]

مگر "معمار حرم" کو "تعمیر دیر" سے فرصت کب تھی اور ہے جو اس وقت متوجہ ہوتے، یا اب توجہ دے سکیں۔ "تعمیر دیر" کی یوں تو ایک دو نہیں بہت سی صورتیں ہیں لیکن فی الوقت ایک ہی کے ذکر پر اکتفا کی جاتی ہے۔

پاکستان میں جسے ہم بڑے فخر سے اسلامی جمہوریہ، کہہ کر اور بتا بتا کر اتراتے پھرتے ہیں۔ اہل کلیسا کے نظام تعلیم [۳۴] (انگلش میڈیم اسکول) کی سرپرستی کیا "تعمیر دیر" کے سلسلے میں خشت اول کی حیثیت نہیں رکھتی اور کیا یہ اقبال کے بقول "دین و مروت کے خلاف" ایک کھلی مگر غالباً "غیر شعوری" "سازش" نہیں۔ اور کیا اس حقیقت کو جھٹلایا جا سکتا ہے:

خشت اول چوں نہد معمار کج　　تا ثریا می رود دیوار کج

"تعمیر دیر" سے مراد ہر وہ شعوری یا غیر شعوری، انفرادی یا اجتماعی قول، فعل اور عمل ہے جو ہماری تہذیب، تمدن، روایات، ثقافت اور اسلامی اقدار کے خلاف یا ان کے ضعف کا باعث ہو۔ کیا ہم دانستہ ایسے افعال کے مرتکب نہیں ہو رہے ہیں جو من حیث القوم ہمارے لیے صرف یہی نہیں تباہ کن ہیں اور جو دین ہیں "خود بیگانگی" یا اس "غلامانہ انداز نظر" کی جس کا بڑا خوبصورت اور جاذب قلب و نظر نام "ترقی" رکھ لیا گیا ہے۔

اس انداز نظر کو نظر انداز کیے بغیر اقبال تک رسائی مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ اقبال کو سمجھنے کی طرح سمجھنا ہے تو ان کے اس مشورہ پر عمل کرنا ہی ہوگا۔

مثل آئینہ مشو محو جمال دگراں　　از دل و دیدہ فرو شوے خیال دگراں
آتش از نالۂ مرغان حرم گیر و بسوز　　آشیانے کہ نہادی بہ نہال دگراں [۳۵]

---

۳۲ ارمغان حجاز ص ۱۴۴
۳۳ زبور عجم صفحہ ۸۳
۳۴ اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم　　اک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف
۳۵ پیام مشرق صفحہ ۱۷۲

اردو کی نثری داستانیں

تحریر: ڈاکٹر گیان چند

خوشحال و اقبالؒ

محمد پرویش شاہین

علامہ اقبال اور خوشحال خان خٹک دونوں سرزمین پاکستان کی ایسی نامور ہستیاں ہیں کہ جن پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ دونوں نے عوام میں ظلم اور جبر کے خلاف جدوجہد پیدا کی اور ان کو اپنی خودی پہچاننے اور اس سے کام لینے کی راہ دکھائی۔ دونوں بڑے حکیم، فلسفی اور نابغۂ روزگار تھے۔ دونوں آفاقی شاعر تھے۔ اور دونوں کا کلام اور ارشادات ہر وقت بھٹکتی ہوئی انسانیت کو راہ دکھا سکتے ہیں۔

خوش قسمتی کی بات ہے کہ علامہ اقبال پر اتنا بڑا کام ہو چکا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے۔ جس سے ان کے صحیح مقام اور عظمت کا پتہ لگ سکتا ہے۔ اور ان کے گفتار، کردار، احساسات اور جذبات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے دل میں انسانیت اور انسان کے لئے کتنا درد تھا اور کتنی تڑپ تھی۔ اور وہ انسان کو کس کھوئے ہوئے مقام پر پہنچانا چاہتے تھے۔

لیکن دوسری طرف خوشحال خان خٹک پر ان کے مرتبہ اور مقام کے مطابق وہ کام نہ ہو سکا جس کا وہ حقدار تھا۔ ورنہ ان کے فلسفہ اور شاعری میں وہ سب کچھ ملتا ہے جو کسی قوم کی تقدیر بدل سکتا اور اس کی حالت کو بہتر بنا سکتا ہو۔ سر دست علامہ اقبال اور خوشحال خان خٹک کی تعلیمات اور مقام پر کچھ لکھنا نہیں چاہتا، صرف خوشحال خان خٹک کے بارے میں ایک ایسے کام کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو علامہ اقبال کی خواہش، آرزو اور ہدایت کے مطابق کیا گیا تھا۔

علامہ اقبال کو خوشحال خان خٹک سے کافی عقیدت تھی اور وہ ان سے کافی متاثر تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے خوشحال خان خٹک کے بہت سے موضوعات اور تشبیہات کو اپنا کر اپنی اردو اور فارسی کے الفاظ میں قارئین کے سامنے پیش کر دیا۔ علامہ اقبال نے پختونوں کی تاریخ، ثقافت اور رسم و رواج کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اور وہ ان کی اسلام دوستی، آزاد پسندی، غیرت، ننگ و ناموس، مہمان نوازی، دیانتداری اور سخت کوشی سے اتنے متاثر ہو گئے تھے کہ انہوں نے صاف الفاظ میں کہا تھا کہ ایشیا ایک جسم ہے اور پختون اس جسم میں دل کی حیثیت رکھتا ہے۔

خوشحال خان اس غیور و جسور مسلمان قوم کی ایک نابغہ شخصیت تھے۔ علامہ اقبال نے خوشحال خان کے بارے میں اپنے پختون دوستوں سے بہت کچھ سنا ہو گا۔ اور ان کے مطالبات جاننے کی کوشش کی ہو گی اور خصوصاً اس بارے میں جالندھر کے نیاز الدین احمد خان جو کہ علامہ اقبال کے بڑے معتقد اور گہرے دوست تھے ان سے بھی بہت کچھ سنا ہو گا۔ جیسا کہ علامہ اقبال ان کو اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں "کہ یہ بہت اچھی بات ہے کہ آپ کے خاندان میں اپنے بزرگوں کا سا ذوق سخن باقی ہے۔ افسوس کہ مجھے پشتو نہیں آتی ورنہ میں سرحد کی اس مارشل شاعری کو اردو یا فارسی کا جامہ پہناتا۔"

لیکن اس کے علاوہ علامہ اقبال کے ایک چھوٹی سی کتاب جس میں خوشحال خان کی سو نظموں کا انگریزی میں بنام THE POEMS OF KHUSHAL KHAN KHATTAK ترجمہ ایک انگریز نے کیا تھا۔ علامہ اقبال کے ہاتھ آئی تھی جو کہ ان کی ذاتی لائبریری میں موجود ہوا کرتی تھی۔ اور بعد میں ان کی وصیت کے مطابق ان کی اور کتب کے ساتھ اسلامیہ کالج لاہور کی لائبریری کو دے دی تھی۔

علامہ اقبال، خوشحال خان خٹک کی ان نظموں سے بڑے متاثر ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ۱۹۲۸ء میں حیدر آباد دکن کے رسالہ اسلامک کلچر میں خوشحال خان پر ایک مفصل مضمون بعنوان THE WARRIOR POET لکھا۔ علامہ اقبال نے اپنے اسلامک کلچر کے مضمون میں خواہش ظاہر کی تھی کہ کسی افغان عالم کو خوشحال خان خٹک پر بھرپور کام کرنا چاہیئے جو تحقیقی بھی ہو اور تنقیدی بھی۔

یقیناً علامہ اقبال کا انتخاب بڑا صحیح اور درست تھا۔ اپنی اس خواہش اور اپنے اسلامک کلچر والے مضمون کے علاوہ علامہ اقبال نے اپنے فارسی اور اردو کلام میں خوشحال خٹک پر بھی لکھا جیسا کہ انہوں نے فارسی میں لکھا ہے۔

خوش سرود آن شاعر افغان شناس   آنکہ بیند باز گوید بی ہراس
آن حکیم ملت افغانیان   آن طبیب ملت افغانیان
راز قومی دید و بیباکانہ گفت   حرف حق با شوخیٔ رندانہ گفت

اور اردو میں یوں لکھا ہے:۔

قبائل ہوں وحدت کی ملت میں گم   کہ ہو نام افغانیوں کا بلند
محبت مجھے ان جوانوں سے ہے   ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند
مغل سے کسی طرح کمتر نہیں   کہستاں کا یہ بچہ ارجمند
کہوں تجھ سے اے ہمنشیں دل کی بات   وہ مدفن ہے خوشحال خاں کو پسند
اڑا کر نہ لائے جہاں باد کوہ   مغل شہسواروں کی گرد سمند

اب آتا ہوں علامہ اقبال کی خواہش کی طرف کہ خوشحال خان پر ایک تحقیقی اور تنقیدی کام کیا جائے۔ ۱۹۶۸ء میں میں پنجاب یونیورسٹی میں تھا۔ میری خوش قسمتی سے لاہور میں مجھے میر عبدالصمد خان صاحب ملے، جو کہ پشتو زبان کے بڑے ادیب ہیں۔ میں کبھی کبھی ان کے دولت کدے پر جایا کرتا تھا۔ اور ان کی پختون تاریخ اور پختون مشاہیر کے بارے میں بات چیت ہوتی تھی۔ ایک دن باتوں باتوں میں خان صاحب نے ذکر کیا کہ لاہور کی کسی خاتون نے خوشحال خان خٹک پر پی۔ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر لی ہے۔ میں خوش بھی ہوا اور حیران بھی کہ لاہور کی ایک خاتون کس طرح خوشحال پر پی۔ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھ سکتی ہے۔ کیونکہ جب تک کسی کو پختون تاریخ اور پختو زبان پر عبور حاصل نہ ہو۔ خوشحال خان جیسی عظیم شخصیت پر قلم اٹھانا بڑی مشکل بات ہے۔ میں نے صمد خان سے محترمہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنیں لیکن انہیں موصوفہ کی صحیح رہائش گاہ کا پتہ نہیں تھا۔ تاہم بات میں نے ذہن میں بٹھا لی۔ اور محترمہ کی تلاش میں لگ گیا۔ محترمہ کی تلاش کے دوران پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری میں گیا تا کہ وہاں سے اتنا معلوم کر سکوں کہ واقعی اس قسم کا کوئی مقالہ لکھا بھی گیا ہے یا نہیں۔ مجھے لائبریری سے معلوم ہوا کہ ہاں واقعی محترمہ نے خوشحال خان پر ایک مقالہ دو جلدوں میں لکھا ہے جس کا نمبر ہے: TB KSSK PART I & II

BIBLIOGRAPHY P X VI – X X V KHUSHAL

لیکن جب میں نے مقالہ دیکھنے اور پڑھنے کی خواہش ظاہر کی تو کاؤنٹر پر کارڈ سے پتہ چلا کہ مقالہ جناب باقر پرنسپل اورینٹل کالج کے نام جاری ہوا ہے۔ میں اس خیال سے باقر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا کہ فی الحال اگر وہ مہربانی فرما کر مقالہ میرے حوالے کر دیں تو میں اسے پڑھ لوں۔ اور چونکہ وہ رہنے والے ہی ہیں لاہور کے، وہ بعد میں اس سے استفادہ کر سکیں گے۔ لیکن باقر صاحب نے لاعلمی ظاہر کی اور فرمایا کہ نہیں ایسا کوئی مقالہ میں نے جاری نہیں کروایا ہے۔ میں نے جب ان کی خدمت میں صحیح صورت حال، کارڈوں پر ان کے نام وغیرہ کے بارے میں بتائی تو انہوں نے پہلے اپنے ہیڈ کلرک اور بعد میں لائبریرین کو بلایا۔ میں خود ان دونوں حضرات کے ساتھ لائبریری میں گیا۔ لیکن دونوں نے واپس آ کر ان کی خدمت میں عرض کیا کہ جناب ایسا کوئی مقالہ ہماری لائبریری میں نہیں ہے۔ میں بڑا آزردہ ہو کر ان کے کمرے سے نکل آیا۔ اور واپس لائبریری میں آ کر ان کو تمام تفصیل سے آگاہ کیا۔ مقالہ تو مل نہ سکا۔ اس لئے محترمہ کے بارے میں، میں نے اپنی تلاش ذرا تیز کر دی۔ آخر کار مجھے ایک صاحب نے بتایا کہ محترمہ ریلوے اسٹیشن کے قریب رہتی ہیں۔ کل جانے کا پروگرام بنایا کہ صبح اٹھ کر کیا دیکھتا ہوں کہ اخبار میں یہ بری خبر پڑھی کہ مس خدیجہ فیروزالدین وفات پا گئیں۔ اخبار نے ان پر بھرپور مضمون لکھا تھا جس میں خوشحال خان خٹک پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے بارے میں بھی تفصیل سے لکھا تھا۔

جب میں کچھ عرصہ بعد لاہور سے واپس آیا تو یہ ساری کہانی میں نے پشتو اکیڈمی کے ڈائرکٹر صاحب کی خدمت میں روانہ کر دی۔ لیکن انہوں نے اس میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ ہاں کوئی سال دو سال بعد جب ان کو خود ذاتی طور پر اس بارے میں ضرورت محسوس ہوئی تو انہوں نے مجھ سے اس بارے میں پوچھا۔ میں نے وہی رام کہانی پھر ان کے حوالے کر دی۔

بات آئی گئی ہوئی نہ مقالہ ملا اور نہ مصنفہ، لیکن بات تھی کہ میرے ذہن پر سے اترتی نہیں تھی کہ ۱۲ اکر پشاور میں ایک کتاب "جدید پشتو ادب" خریدی جو کوہاٹ کے مشہور ادیب ایوب صابر کی لکھی ہوئی تھی۔ جب میں کتاب پڑھنے لگا تو مندرجہ ذیل اقتباس نے میرے ذہن کو ایک مرتبہ پھر تازیانے لگائے۔

"جس زمانہ میں علامہ اقبال، خوشحال خان خٹک پر بھرپور کام کرنے کی خواہش کر رہے تھے۔ انہی دنوں پنجاب کی ایک عالم و فاضل خاتون محترمہ مس خدیجہ فیروزالدین نے پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کے لئے خوشحال خان خٹک کا موضوع منتخب کیا۔ موصوفہ نے اپنے اس تحقیقی مقالے کا آغاز ۱۹۲۰ء میں کیا اور ۱۹۳۹ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ موصوفہ نے اپنے اس تحقیقی مقالے کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ اس کام سے علامہ اقبال کو خاص دلچسپی تھی۔ اور وہ ان سے وقتاً فوقتاً اس سلسلے میں صلاح و مشورہ کرتی رہیں۔ محترمہ خدیجہ فیروزالدین نے خوشحال خان خٹک پر جو تحقیقی مقالہ مکمل کر لیا ہے۔ وہ دو جلدوں میں ہے۔ ان کا تعلق ان ہزارہ افغان خاندانوں میں ایک سے ہے جو بہت عرصہ سے پنجاب میں آباد ہیں۔ اور جو اب پشتو بھول گئے ہیں۔ موصوفہ کی خوش قسمتی تھی کہ ان کے والد بزرگوار کسی ملازمت وغیرہ کے سلسلے میں بنوں میں مقیم تھے کہ آپ پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم یہاں حاصل کی اور پشتو بھی انہوں نے ایسی سیکھی جیسی مادری زبان ہوتی۔ ذات اور قوم کے لحاظ سے تو وہ پشتون تھیں ہی۔ بنوں کی پیدائش اور رہائش نے ان کو لسانیاً بھی پشتون بنا دیا۔ لہذا خوشحال خان خٹک پر ان کا مقالہ ان کی براہ راست کاوشوں اور خوشحال خان خٹک کو خود پشتو ہی میں پڑھنے اور سمجھنے کا نتیجہ ہے۔"

اسی بیان سے متاثر ہو کر میرا خوابیدہ جذبہ ایک بار پھر بیدار ہوا۔ اور اسی وجہ سے میں نے پشتو کے رسالہ "اباسین" کے لئے مذکورہ مقالہ پر ایک مضمون لکھا جو کافی عرصہ گزرنے کے بعد رسالہ نے چھاپا۔ میرا خیال تھا کہ کوئی صاحب نظر اور مخیر صاحب اس کام کی

طرف توجہ کرکے مقالے کے چھپوانے کا بندوبست کر لیں گے۔ لیکن تاحال کچھ نہ ہو سکا۔

خدا کی قدرت کہ جس کام کے لئے میں بے انتہا بے چین تھا کیا دیکھتا ہوں کہ ڈاکٹر عقاب خٹک کا ایک پمفلٹ (پشتو زبان میں) بعنوان "د خوشحالیات" میرے ہاتھ آیا۔ یہ پمفلٹ عقاب خٹک نے لکھا تھا۔ وہ پشتو اور اردو کے بڑے ادیب بھی ہیں۔ اور ان کا تعلق خاص بنوں شہر سے ہے۔ پمفلٹ کو دیکھ کر میں دنگ رہ گیا کہ جو کچھ مجھ پر بیتا ہے بالکل وہی کچھ عقاب خٹک پر بھی گزرا ہے۔ جیسا کہ وہ اپنے کتابچہ میں تحریر فرماتے ہیں "کہ مس خدیجہ دراصل پنجاب کے ککے زئی خاندان سے ہیں۔ ان کے والد بنوں میں مقیم تھے۔ خدیجہ نے پشتو زبان بنوں میں سیکھی تھی۔ اور بی۔ اے تک تعلیم یہاں حاصل کی تھی۔ ماسٹر ٹیک چند بی۔ اے یہاں ان کے تاریخ اور انگریزی کے لیکچرار تھے۔ پہلے پہل تو ماسٹر صاحب خود ہی کہا کرتے تھے کہ میں خوشحال خان خٹک پر ایک کتاب لکھ رہا ہوں۔ لیکن بعد میں اس بارے میں کچھ بھی اظہار نہیں کرتے تھے۔ تقریباً دس سال بعد ہمیں پتہ چلا کہ خدیجہ پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے خوشحال خان پر ڈی۔ لٹ کی ڈگری کے لئے کام کر رہی ہے۔

ہم نے اپنی ایک کتاب مکمل کرنے کے بعد مس خدیجہ کی کتاب دیکھنا چاہی۔ اور اسی غرض سے جامعہ پنجاب کے کتب خانہ کو مرحومہ کے تھیسس کی مائیکروفلم کے لئے لکھا۔ جواب میں انہوں نے لکھا کہ وہ مقالہ ہم نے تنقید اور جانچ پرکھ کے لئے ایک ماہر کے حوالے کر دیا ہے۔ اور ابھی تک واپس نہیں آیا ہے۔ موجودہ ریکارڈ سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ مقالہ کی پہلی جلد تقریباً تین سو صفحوں پر مشتمل ہے۔ اور اسی پر فلم کے لئے سو روپے خرچ آئے گا۔ اور جب ہم نے اپنے دوسرے خط میں رقم دینے کی خواہش ظاہر کی اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ رقم کس ذریعہ سے بھیج دیں۔ تو وہ جواب دینے میں خاموش ہو گئے اور ابھی تک خاموش ہیں۔

تھوڑی سی پوچھ گچھ کے بعد ہمیں پتہ چلا کہ کتب خانہ نے جس ماہر کا ذکر کیا تھا وہ اورینٹل کالج کے پرنسپل باقر صاحب ہیں۔ ہم نے ان کی خدمت میں خط لکھا۔ انہوں نے جواب میں لکھا کہ میں نے تھیسس حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں نہیں ہے۔ ڈاکٹر باقر کے خط نے ہمیں شک میں ڈالا اور حقیقت معلوم کرنے کے لئے پنجاب میں اپنے ایک دوست کو جو کہ پنجاب یونیورسٹی کے ایک شعبہ میں ملازم تھے کو لکھا۔ انہوں نے اپنے جواب میں لکھا کہ تھیسس ابھی تک ڈاکٹر باقر کے پاس ہے۔ اور عام قاعدہ کے خلاف دونوں نسخے ڈاکٹر باقر کو بھیجے گئے ہیں۔

اس تحقیق کے بعد ہم نے جامعہ پنجاب کے وائس چانسلر کو ایک خط لکھا۔ لیکن انہوں نے ڈاکٹر باقر کی خاطر سے جواب نہیں دیا۔ اور یہ بات یونہی رہ گئی۔"

اس کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عقاب خٹک نے بھی بات آگے بڑھانے کی کافی کوشش کی ہے اور اس کے علاوہ اور ذریعوں سے بھی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ جیسا کہ وہ لکھتے ہیں کہ ہمارے خط کے جواب میں جارج مارگنسٹرن نے لکھا کہ مجھے ان کا تھیسس ملا تھا۔ اور میں نے واپس بھیجا ہے اور ساتھ ہی میں نے ان کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دینے کی اپنی سفارش بھی بھیجی ہے۔ اس کے بعد جب ہم نے ایک ملاقات میں ڈاکٹر باقر سے یہ پوچھا کہ مرحومہ نے اپنے تھیسس میں ہمارے موضوع کے مطابق کیا کچھ لکھا تھا۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ "مجھے کچھ بھی نہیں"

اتنی تفصیل میں جانے سے میرا مطلب یہ ہے کہ آخر مرحومہ کا مقالہ کہاں گیا۔ اور کون لے گیا۔ اور کیوں لے گیا۔

اب یہ کام اقبال اکیڈیمی اور پشتو اکیڈیمی کا ہے کہ وہ اس مقالہ کے بارے میں معلومات کریں اور مقالہ کو حاصل کریں۔ اور نہ صرف حاصل کریں بلکہ اس نایاب اور معنوی کام کو چھپائی کے زیور سے آراستہ کر دے۔ جیسا کہ دونوں اداروں نے علامہ اقبال کی تمام کتب کے پشتو

تراجم کرتے وقت ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کیا تھا۔ کیونکہ یہ مقالہ علامہ اقبال کی خواہش اور آرزو کے تحت لکھا گیا تھا۔ اور اس میں ان کا مشورہ اور صلاح بھی شامل تھی۔ اب چاہیئے کہ علامہ اقبال کی یہی خواہش عملی صورت میں لوگوں کے سامنے آ جائے اور خصوصاً پشتو اکیڈمی کے ذمہ تو یہ فرض کفایہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ کتابی صورت میں آنے کی صورت میں خوشحال خان خٹک کے افکار، جذبات، احساسات اور فلسفہ و کلام کے بارے میں نئی نئی راہیں متعین ہو جائیں گی۔ اور مزید تحقیق و تنقید کے لیئے راستہ کھل جائے گا۔

دوسرا یہ کہ اگر محترمہ خدیجہ مرحومہ سے مذکورہ تھیسس میں کچھ کمی رہ گئی ہو تو نقادانِ فن و تاریخ ان کی اچھی طرح ناپ تول کر کے بھس سے گودانہ سے الگ کر سکیں گے۔ اور اسی طرح ادب کا یہ قیمتی ورثہ ہمارے ہاتھ آ جائے گا۔ اور اس سے لوگ مستفید ہو سکیں گے۔

ویسے بھی سالِ رواں کو "جشنِ خوشحال" قرار دیا گیا ہے۔ اور ان کی تین سو ویں برسی منانے کے لیے مختلف قسم کے پروگرام بنائے گئے ہیں۔ اس لیئے خوشحال ادبی جرگہ بھی اس بارے میں اپنی سرگرمی دکھائے تاکہ "جشن" پورے معنوں میں جشن بن سکے۔

بابائے اردو کی تصانیف

مرحوم دہلی کالج	۴ روپے
سر سید احمد خان	۶ روپے
نصرتی ملک الشعرائے بیجاپور	۵ روپے
افکارِ حالی (حالات و افکار)	۷ روپے پچاس پیسے

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ۔ کراچی نمبر ۱

اقبال زمان سے لازمانیت تک

ریاض صدیقی

زماں یعنی وقت انسانی تاریخ کے ہر اس دور میں جہاں شعور و آگہی کا اجالا[1] تھا زیرِ بحث رہا ہے۔ کرۂ ارض پر زندگی کی پوری داستان وقت کے سمندر ہی سے گزری ہے۔ جہاں حرکت ہے وہاں تغیر بھی ہے اور وقت بھی ہے۔ مذاہب قدیم کی فلسفیانہ بحثوں میں بھی وقت نمایاں اور اہم موضوع رہا ہے۔ مذہبی پیشواؤں نے بھی اس کی اہمیت کا بار بار ذکر کیا ہے۔ یونان کے تقریباً سارے مکاتب اس بحث میں الجھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہاں تک عہدِ اسلام میں مسلمان مفکرین اور سائنسدانوں نے اس موضوع کو فکری مباحث کے ساتھ ساتھ سائنس کے تجرباتی عمل کا حصہ بنا کر قرآن کریم اور احادیث نبوی کے زمانی نظریات کی تعبیر و تشریح کی اور مسئلہ کو اس انتہا تک لے آئے جہاں سے مغرب کے مفکروں اور سائنس دانوں کو اپنا سفر شروع کرنے کے لئے راستہ مل گیا۔

گزرے ہوئے زمانوں میں اس موضوع پہ دفتر کے دفتر لکھے گئے لیکن چند بنیادی حوالوں کو چھوڑ کر ان دفاتر کی حیثیت اب آثارِ قدیمہ سے زیادہ نہیں ہے۔ جدید فکری تاریخ کا سرچشمہ اولاً قرآن کریم و احادیث مبارکہ اور ثانیاً جدید طبیعیات و ریاضی کے نتائج ہیں۔ یہاں قابلِ ذکر حقیقت یہ ہے کہ زمان کے قرآنی نظریے اور جدید نظریہ زمان کے مابین ایک ہمہ گیر ربط و اتحاد ہے۔

بیسویں صدی عیسوی کے مسلمان حکماء کی فہرست میں جن لوگوں نے فکری اور اجتماعی سطح پر اس موضوع کا احاطہ کیا ہے۔ ان میں صوفیائے کرام، شاہ ولی اللہ دہلوی اور مرزا غالب کے بعد اگر کوئی نام آ سکتا ہے تو وہ اقبال کا نام ہے۔ انہوں نے مغرب و مشرق کے فکری سرمائے سے اپنی مرضی کے جواہر جمع کر کے مسئلے کو گرفت کیا اور اس پر حاوی ہونے اور آخری نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کی۔

اقبال" برِ صغیر کی زوال پذیر ملتِ اسلامیہ کو جدید سائنس کی فکری اہمیت سے آگاہ کرنا چاہتے تھے۔ وقت تغیر اور حرکت جیسے موضوعات ان کی شعری فکر کا ہمیشہ جزو بنے رہے۔ زمان کے موضوع پر جستجو کے آثار تو ان کی ابتدائی شاعری میں نظر آنے لگے تھے۔ چنانچہ بانگِ درا کی بعض نظموں میں بھی "زمان" کی مرکزیت کا شعور ملتا ہے[2]

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں　　محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

---

[1] قبل از تاریخ کے وحشی دور کے بعد والا زمانہ۔

[2] بشیر احمد ڈار کا خیال ہے کہ یہ سلسلہ اسرارِ خودی سے شروع ہوتا ہے ماہ نو ص ۱۷۷ اپریل ۱۹۷۰ء

فکری وحدت کی شکل میں البتہ یہ موضوع اسرارِ خودی ۱۹۱۵ء کی نظموں میں نمایاں ہوا ہے۔ اس دور کی شاعری میں انہوں نے امام شافعیؒ کے مقولے "الوقت سیف" (وقت ایک تلوار ہے) سے بھی استفادہ کیا ہے۔ پیام مشرق اور جاوید نامہ تو زمان کے موضوع پر ان کی شعری فکر اور تخلیقی کرب کا منظر نامہ نظر آتے ہیں اور خطبات اس سلسلے کا تکملہ ہیں۔ جہاں انہوں نے فلسفہ کی زبان میں اپنے علیحدہ نظامِ فکر کو واضح کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے ہیں۔

زمان جیسے فلسفیانہ سائنسی اور مذہبی موضوع سے اقبال کی غیر معمولی دلچسپی کا اصل سبب وہ فکری یکسانیت تھی جو قرآن و حدیث اور جدید طبیعیات و ریاضی میں نظر آتی ہے۔ خطبات میں انہوں نے بڑے اعتماد کے ساتھ اس حقیقت کا ذکر بھی کیا ہے کہ مسلمانوں کے لئے "زمان" کا موضوع نیا نہیں ہے بلکہ اہلِ اسلام کی فکری تاریخ میں یہ موضوع شروع ہی سے سرِ فہرست رہا ہے۔ مسلمانوں کے لئے اس کی اہمیت موت اور زندگی سے کم نہیں ہے۳

اقبال کو اچھی طرح پتہ تھا کہ اہلِ تصوف اور علمائے اسلام اس خاص موضوع پر خوب خوب لکھ چکے ہیں۔ انہوں نے ان حوالوں تک پہنچنے اور ان کو سمجھنے کے لئے سو جتن کئے۔ اس بات کا اندازہ ان کے بعض خطوں خصوصاً سید سلیمان ندویؒ اور پیر سید مہر علی گولڑوی کو لکھے گئے۔ خطوں سے ہوتا ہے سید سلیمان ندویؒ کو وہ سند تصور کرتے تھے اور علم و افکار کے معاملات و موضوعات پر ان سے مشورے طلب کرتے تھے۔ زمان کے موضوع پر انہوں نے مارچ ۱۹۲۸ء سے خط و کتابت کا جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ ۱۹۳۲ء تک جاری رہا۴ انہوں نے اسی زمانے میں "شمش بازغہ" یہودی عالم کلیم بن میمون اور حدیث مبارک "لا تسبوا الدھر" (وقت کو برا نہ کہو کہ وہ خدا ہے) سے دلچسپی کا اظہار کیا اور ندوی صاحب سے فرمائش کی وہ اصل ماخذات کی فراہمی میں معاونت فرمائیں۵ ان دنوں وہ "فلسفہ اسلام میں زمان کی حقیقت" پر ایک مقالہ بھی لکھنا چاہتے تھے اور۶ مدارس کے لئے اپنے لیکچرز کی تیاری بھی کر رہے تھے۔ اس موضوع پر انہیں ایک عربی دستاویز "ماہیۃ الزمان" کی تلاش بھی تھی اور یہ رسالہ سید ر ح کی وساطت سے ان تک پہنچ بھی گیا تھا۷ اس دور کے ایک خط سے پتہ چلتا ہے کہ انور شاہ کاشمیریؒ نے بھی انہیں عراقی کی نہایت اہم کتاب۸ "فی درایۃ الزمان" روانہ کر دی تھی۔ زمان کا موضوع ۱۹۲۵ء کے بعد بدستور اقبال کی فکر کا محور بنا رہا۔ اس موضوع پر سب سے پہلے انہوں نے اورینٹل کالج لاہور کے ایک جلسے میں اظہارِ خیال کیا تھا۹

---

۳ دی ری کنسٹرکشن آف ریلیجس تھاٹ ان اسلام ص ۱۳۲ مطبوعہ شیخ اشرف لاہور ۱۹۷۷ء ۴ ماہ نو ص ۷۹-۱۷۷ اپریل ۱۹۷۹ء ۵ ایضاً ص ۱۷۹ ۶ ایضاً ۷ مورخہ ۱۸ ستمبر ۱۹۳۲ء ۸ مراسلہ بنام پیر سید مہر علی گولڑوی ۲۸ اگست ۱۹۳۲ء ب اقبال کا خیال غلط تھا اس کتاب کا مصنف عراقی نہیں بلکہ "عین القضاۃ" تھا۔ اس کا اصل نام عبداللہ بن محمد ہے۔ زیرِ حوالہ کتاب کا نسخہ اب اقبال اکیڈمی میں بھی دستیاب ہے۔
۹ ماہ نو ص ۱۰ اپریل ۱۹۷۷ء

خطبات میں اقبال نے مغرب و مشرق کے تقریباً تمام قابلِ ذکر فلسفیوں کو حوالہ بنا کر ان کے افکار و نظریات پر تنقیدی بحث کی ہے۔ چنانچہ وہ یونانی مفکر زینو سے[10] بات شروع کرتے ہیں۔ زینو کے نزدیک حقیقت فی الزمان محض دھوکا ہے۔ اس نظریے نے قدیم یونان ہی میں ہلچل نہیں پیدا کی بلکہ اثرات کا وہ تسلسل قائم کیا جو صدیوں تک جادو جگاتا رہا۔ مسلمان حکماء میں غزالی اور مغربی مفکروں میں پروفیسر ٹیگرٹ نے ان تاثرات کے تحت اپنے اپنے رویے وضع کیے جبکہ ارسطو۔ ابن رشد۔ نیوٹن اور برٹرینڈ رسل جیسے مفکروں نے بعض تبدیلیوں اور اضافوں کے ساتھ زیرِ حوالہ اثرات سمیٹے ہیں۔ فکر و فلسفہ اور سائنس کی اسلامی تاریخ میں اشاعرہ مکتبۂ فکر کو نمایاں مرتبہ حاصل ہے۔ اس مکتبۂ فکر کے روحِ رواں ابوالحسن الاشعری ہیں۔ باقلانی۔ رازی اور بغدادی اس کے نمائندہ دانشوروں میں ہیں۔ اشاعرہ نے سب سے پہلے زماں کے ایسے نظریے کی داغ بیل ڈالی جو آج کی جدید کوانٹم طبیعیات میں بھی نظر آتا ہے۔ اس مکتبۂ فکر کے نزدیک زماں ایک غیر مسلسل حقیقت ہے۔ ٹیکنیکی لفظوں میں اس کو "خیالی اٹمیت" (CONCEPTUAL ATOMISM) کہا گیا ہے۔ اس فکر کے مطابق کائنات ہر لمحہ فنا ہو کر از سرِ نو تخلیق ہوتی رہتی ہے۔ زماں کے بارے میں اہلِ تصوف کی فکری تعبیرات و تشریحات کا ماخذ بھی اشاعرہ ہی کی فکر ہے۔ جس کی دھوپ چھاؤں ہمیں ابن عربی سے امام الانقلاب شاہ ولی اللہ دہلوی رح تک دکھائی دیتی ہے۔ اقبال نے اشاعرہ تعبیرات سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے ان کا نظریہ ایٹمی زمان ایک کمزور نظریہ ہے[11]۔ اس نظریے کی رو سے وقت انفرادی آنات (NOW) کے تواتر کا عمل بن کر رہ جاتا ہے۔ گویا ہر دو انفرادی آنوں کے بیچ ایک خلا یا لازمی کیفیت ہے اور اس کیفیت کا نہ کوئی مقصد ہے اور نہ معنی ہیں۔ اس لامعنونیت کی وجہ اقبال کے نزدیک اشاعرہ کا معروضی طرزِ مطالعہ ہے۔ ان اعتراضات کے ساتھ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ اشاعرہ کے افکار طبیعیات جدید کے نتائج مختلف نہیں ہیں[12]

زیرِ نظر اعتراض صحیح نہیں ہے۔ عدم تسلسل اور نہ ہونے کا لمحہ (NON - BEING) جدید طبیعیات اور ریاضی کی رو سے ثابت ہیں۔ کسی بھی ایٹم کے متعین مداروں (ORBITS) کے درمیان یہ کیفیت ہوتی ہے۔ الکٹرون جب ایک مدار میں بہت زیادہ توانائی جذب کر لیتے ہیں تو انتہائی جوش میں اپنا مدار چھوڑ کر دوسرے مداروں میں چھلانگ لگا جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ الکٹرون اپنے اصل مدار کی طرف واپسی میں توانائی خارج کرتے ہیں۔ توانائی کے اخراج و انجذاب کا یہ عمل جو ایٹمی طیف پر خطوط کی صورت اشارے دیتا ہے غیر مسلسل ہی ہوتا ہے۔ تسلسل کے دو وقفوں کے درمیان لازمانیت یا عدم کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا ہے۔

ابن خلدون کے نظریہ تاریخ کا احاطہ کرتے ہوئے اقبال نے زماں کے بارے میں بعض تصورات کو اس مؤرخ سے منسوب کیا ہے۔ تاریخ خلدون کے نزدیک ایک مسلسل اور اجتماعی حرکت کا نام ہے اور یہ حرکت ظاہر ہے کہ زماں ہی میں صورت پذیر ہوتی ہے۔ تاریخ کے اس حرکی عمل کو وہ تخلیقی تصور کرتا ہے لیکن ایسا عمل جس کا راستہ پہلے سے متعین نہ ہو۔ اقبال ان نظریات سے کلی اتفاق کا اظہار کرتے ہیں۔[13] عراقی (۱۱۱۰ - ۱۰۵۸ء) کے نظریات کا ذکر کرتے ہوئے ملا دوانی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ وہ زماں کی متعدد کیفیتوں کا ادراک رکھتا تھا۔ چنانچہ اس نے مادی اور غیر مادی کائنات کے حوالوں سے زماں کے علیحدہ علیحدہ درجے مقرر کیے۔ اس کے نزدیک غیر مادی اشیاء کا زماں بھی پھیروں کی ترتیب رکھتا ہے۔ لیکن یوں کہ مادی کائنات کا ایک سال غیر مادی عالم کا ایک

---

[10] ۴۹۰ - ۴۳۰ ق م [11] دی ری کنسٹرکشن آف ریلیجس تھاٹ ان اسلام ص ۷۳۔ [12] ایضاً ص ۷۴۔ [13] ایضاً ۱۴۱

دن ہوتا ہے۔ غیر مادی عالم کی انتہا ربانی (DIVINE TIME) ہے۔ یہاں نہ پھیرے ہیں نہ تواتر ہے نہ حرکت ہے اور نہ تغیر ہے۔ گویا یہاں تقسیم کا کوئی وجود ہی نہیں ہے[۴۴] عراقی یقیناً پہلا مفکر ہے جس نے مادی وقت (SERIAL TIME) اور ربانی وقت (DIVINE TIME) کی اصطلاحات وضع کرکے اس فکر کا آغاز کیا جو اقبال کو قبول ہے۔ اس فکری اتحاد کے باوجود حسب عادت عراقی پر انہوں نے ایک اعتراض بھی قلمبند کیا ہے کہ زمان ربانی اور زمان مادی کے درمیان ربط و تعلق سے بے خبر تھا۔[۴۵] رازی کے نظریہ زمان کی تعریف کرتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں کہ اس مفکر نے موضوع پر زیادہ سنجیدگی سے بحث کی ہے لیکن حسب عادت یہاں بھی انہیں رازی کے معروضی انداز نظر اور کسی فیصلے کے فقدان سے مایوسی ہوتی ہے[۴۶]

مغرب کے مفکروں اور سائنس دانوں میں زمان سے بحث نیوٹن کے یہاں نظر آتی ہے۔ اس کے مطابق زمان ایک مطلق شے ہے۔ جس میں مسلسل بہاؤ کی کیفیت ہے۔ اقبال اس نظریے کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔ یہاں بھی انہیں معروضی نقطۂ نظر کا احساس ہوتا ہے[۴۷] مغرب کے دوسرے مفکروں اور سائنس دانوں میں انہوں نے نیٹشے۔ برگساں۔ الگزنڈر اور آئین اسٹائین کو نمایاں اہمیت دی ہے۔ نیٹشے (۱۸۴۴ء - ۱۹۰۰ء) کے خیالات سے گذرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس فلسفی نے زمان کے نظریے کا تانا بانا شوپنہار اور کانٹ کے افکار سے تیار کیا ہے۔ وہ وقت کو موضوعی انداز نظر سے پرکھنے کے بجائے اس کو ایسی حقیقت تصور کرتا ہے جس کا سلسلہ لامتناہی ہے۔ اور جس کا ادراک پھیروں سے ہوتا ہے۔ گویا کائنات میں نئے واقعات نمودار نہیں ہوتے ہیں۔ جو کچھ ہو رہا ہے ماضی میں بھی بار بار ہوا تھا اور مستقبل میں بھی بار بار ہوتا رہے گا[۴۸]

عہد حاضر کا حرف آخر البرٹ آئین اسٹائن ہے جس کی ریاضیات اور طبیعاتی انکشافات کے بعد بیسویں صدی سے پہلے والے تمام تکنیکی و تجرباتی تعینات ماضی کی یادگار بن کر رہ گئے ہیں۔ آج کی کائنات آئین اسٹائین کی کائنات ہے۔ اقبال شناس عالمی سائنس داں کے انکشافات کو کھلے ذہن سے قبول کیا ہے۔ نظریہ اضافیت اور کائنات کے تصور پر وہ آئین اسٹائین کے ہمنوا ہیں۔ اس کے نظریہ زمان و مکاں کو بھی تسلیم کرتے ہیں البتہ حسب عادت اپنی جذباتیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے "چہار ابعادی" FOUR DIMENSIONAL "نظام میں وقت کی حیثیت پر انہیں اعتراض ہے کہتے ہیں کہ اس ماہر طبیعات و ریاضیات نے وقت کو سہ ابعادی نظام میں چوتھے بعد کا درجہ دے کر اس کی آزادانہ اور تخلیقی حیثیت کو بے معنی بنا دیا ہے۔ اس طرح وقت کی اساسی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اعتراض ازسرتا پا بے بنیاد ہے اور اس کی تردید اقبال کے ایک معتقد اور معروف سائنس داں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے بھی کی ہے۔

نظریہ زمان کے بارے میں اقبال کی جستجو کا سفر جزوی اختلافات کے باوجود اس مفاہمت پر ختم ہوتا ہے جو انہوں نے قرآن کریم۔ حدیث۔ عراقی اور برگساں کے نظریات سے کی ہے۔ برگساں پر اعتراض کے باوجود وہ اس کے نظریہ زمان خالص PURE DURATION کے مداح ہیں۔ انہوں نے پرزور لفظوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ برگساں وہ پہلا مفکر ہے جس نے پوری

---

[۴۴] ایضاً ص ۷۷ اور ۳۸ - ۱۳۵ [۴۵] ایضاً ص ۵۰ اور ص ۱۲۸ [۴۶] ایضاً ص ۷۶ [۴۷] ایضاً ص ۷۲ [۴۸] ایضاً ص ۱۵ - ۱۱۴

سنجیدگی اور فکری گہرائی کے ساتھ اس موضوع کو تسخیر کیا ہے۔ یہاں انہیں شکایت صرف یہ ہے کہ اولاً برگساں وقت کی مقصدیت سے انکار کرتا ہے اور آخراً اس کے زمانِ خالص میں خودی کا گزر نہیں ہے۔ عراقی اور برگساں کی حدود سے گزر کر انہوں نے فلسفہ زماں کو اپنے تصورِ خودی[۱۸] سے ہم رشتہ کر کے ایک علیحدہ راستہ نکالنے کی کوشش کی ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں ان افکار و نظریات کا مطالعہ کیجیے جو زماں کے بارے میں اقبال کے یہاں ایک مستقل فکر کا درجہ پاتے ہیں۔

اقبال نے اولاً قرآن کریم کے بعض ارشادات کو حوالہ بنایا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس بحث میں ایک آیت نقل کی ہے جس کے معنی ہیں کہ دن کے بعد رات اور پھر رات کے بعد دن اور اس طرح شب و روز کے پھیروں میں اللہ کی ایک نشانی ہے۔[۲۰] انہوں نے عراقی کا اتباع کرتے ہوئے وقت کو ربانی اور غیر ربانی کی حدوں میں بانٹتا ہے۔ چنانچہ سرورِ کائنات کی ایک حدیث کے حوالے سے اس مسئلے کو وہ دہر اور عصر کی اصطلاحوں سے واضح کرتے ہیں۔ دہر ربانی زمان ہے جبکہ عصر عام زمان ہے۔[۲۱] اپنا ایک علیحدہ راستہ نکالنے کی جدوجہد میں ان اصطلاحوں کی جگہ انہوں نے خودی کے حوالے سے عاقل انا اور فاعل انا کی اصطلاحیں تلاش کی ہیں۔ اقبال اپنی بحث کو اس نتیجہ تک لاتے ہیں کہ زندگی اور کائنات وقت میں موجود ہیں۔ یہ تصور برگساں ہی سے مستعار ہے۔ "وقت خالص" کی اصطلاح پر اپنی بحث میں انہوں نے قرآن حکیم کے بعض ارشادات کو بھی حوالہ بنایا ہے۔[۲۲] کہتے ہیں کہ شعور گہرے داخلی تجربوں سے گزر کر منکشف کرتا ہے کہ زمانِ خالص لمحوں کی حرکت کا نام نہیں ہے بلکہ ایک نامیاتی وحدت کا عالم ہے جہاں ماضی حال میں اندر آتا ہے۔ اور حال کے لئے محرک بنتا ہے۔ ماضی کی حال پر اثر اندازی کے باوجود یہ اثر پذیری آئندہ کے سفر کو روکتی نہیں ہے۔ اس زمانی کیفیت میں ایک مقصد ہے اور یہی مقصد ایک طرف حال کو معنی آفریں بناتا ہے اور دوسری طرف مستقبل کی سمت کا اشاریہ بنتا ہے۔[۲۳] مستقبل کوئی متعین شے نہیں ہے بلکہ ایک کھلے ہوئے امکان کی حیثیت سے موجود ہے۔ زمان کا یہ نظریہ خود بخود انہیں تقدیر جیسے متنازعہ مسئلے تک لاتا ہے اور وہ تقدیر کے مروجہ سوقیانہ تصور کی نفی کرتے ہیں۔ اقبال کا خیال ہے کہ قرآن کریم نے جس عمل کو تقدیر کہا ہے وہ زمانِ خالص ہی ہے اور زمانِ خالص بہر صورت ایک نامیاتی کل ہے۔ تقدیر اس زمان کا نام ہے جب اس کے اندر چھپے ہوئے امکانات ظاہر نہیں ہوتے۔[۲۴] خدا کے تخلیقی حیات کے عضوی کل میں مستقبل یقیناً پہلے سے موجود رہتا ہے لیکن وہ واقعات کی متعین اشکال اور مقررہ تنظیم کی صورت میں نہیں ہے۔ بلکہ صرف کھلے امکانات کی شکل میں ہے۔

خودی اپنی انتہا پر خدا ہے چنانچہ اقبال کے نزدیک خودی وہ وسیلہ ہے جس کے ذریعہ ماہیتِ زماں کا ادراک ہو سکتا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

انتہائی خودی زمانِ مجرد میں رہتی ہے۔ زمانِ مجرد میں رہنا انتہائی خودی کا اثبات ہے۔

اس طرح زمان و مکان کی خارجی کائنات میں فاعل انا کا عمل دخل ہوتا ہے اور فاعل خودی کا زمان پھیروں سے ترتیب پاتا ہے۔ یہاں لمحے بھی ہوتے ہیں اور زمانے بھی ہوتے ہیں۔ تغیر اس زمان کا قانون ہے۔ عاقل انا انتہا ہے۔ یہاں صرف خدا ہے

---

۱۹ ایضاً ۱۴ - ۴۸ اور ۴۷، ۲۰ ایضاً ۲، ۲۱ ایضاً ۲۲ ایضاً ص ۵۸ ۲۳ ایضاً ۲۴ ص ۵۰ - ۴۹ اور ۵۷

وہ خدا جو تخلیقی شخصیت رکھتا ہے اور نشو و نما و ارتقا پاتا ہے۔ عاقل انا کا زمان زمان خالص ہے۔ یہ محض ایک آن ہے زمانِ خالص کے ساتھ تقسیم کا تصور نہیں ہے اس کا تجزیہ ناممکن ہے۔ یہاں نہ تواتر ہے نہ زمانے ہیں اور نہ تغیر ہے[25]

مجموعی اعتبار سے اقبالؔ کی پوری فلسفیانہ بحث کا مقصد یہ باور کرانا ہے کہ حیات اور کائنات زمان میں ہیں اور زمان ہی بنیاد ہے۔ زمان ہی سچائی ہے اور ایک مرحلے پر زمان ہی خدا بھی ہے۔ اس طرح انھوں نے زمانِ طبیعی اور زمانِ خالص کے مابین ناقابلِ تسخیر تعلق کی نشاندہی کی ہے۔ کہتے ہیں زمان و مکاں انتہائی خودی کے امکانات ہیں جن کا کچھ حصہ ہمارے زمان و مکان کی صورت میں ہمارے پیش نظر ہے۔ ان کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ خالص معروضی انداز نظر سے زمان کی ماہیت کا مطالعہ صحیح نتائج کی نشاندہی نہیں کر سکتا ہے[26]

زیر نظر مطالعہ بتاتا ہے کہ اقبالؔ نے قرآن مجید، حدیث نبویؐ اور امام شافعی کے حوالوں سے زمان کی حسی فکر کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے اس کی مینا ابن عربی، صوفیائے کرام، عراقی، برگساںؔ، وہائٹ ہیڈ اور آئن اسٹائن کے افکار و نظریات سے روشنی حاصل کر رہی ہے۔ البتہ اس سفر میں وہ وہائٹ ہیڈ اور آئن اسٹائن کے راستے سے مڑ کر برگساں کے راستے پر چل پڑتے ہیں،

دسویں صدی ہجری کی ادبی روایات کا سراغ

دیوان حسن شوقی

مرتبہ : ڈاکٹر جمیل جالبی
قیمت : پانچ روپے
انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ۔ کراچی نمبر ۱

---

[25] ایضاً ۹۴-۹۸۔ [26] پچھلے دنوں حسن عسکری مرحوم کی تازہ کتاب شائع ہوئی۔ اس کتاب میں نہایت اعتماد کے ساتھ اور بغیر کسی دلیل یا حوالے کے مغرب و مشرق کے مجموعی افکار کو مسترد ہی نہیں کیا گیا ہے بلکہ جدید سائنس و ٹیکنالوجی کے زیر اثر فروغ پانے والی ساری فکر کو لغو قرار دینے کی احمقانہ کوشش بھی کی گئی ہے۔ عسکری مرحوم کی پوری کوشش ماضی پرست مولویوں کے عقائد و افکار کے دفاع پر صرف ہوتی ہے۔ اس کتاب میں جو دراصل ان کے سرسری اور نامکمل نوٹس۔ (NOTES) کا مجموعہ ہے بغیر نام لیتے ہوئے اقبالؔ کے افکار و نظریات کو بھی مسترد کیا گیا ہے۔ اس مجموعی بحث سے عسکری مرحوم نے کچھ ایسا تاثر پیش کیا ہے کہ ان کے نظام فکر کو سختی اور طاقت کے ساتھ نافذ کیا جائے۔

اقبالؒ — عاشقِ رسول ﷺ

سید اعظم رضوی

ابنِ حزمؒ کہتے ہیں "محبت کی حقیقت و ماہیت کے بارے میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے اور علماء نے اس میں طوالت سے کام لیا ہے۔ اس ضمن میں میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ محبت اس اتصال کا نام ہے جو نفس انسانی کے اجزا اکے عنصرِ رفیع میں پایا جاتا ہے":

نفسِ انسانی کے عنصرِ رفیع میں پایا جانے والا یہ جذبہ اپنی صداقتوں کے بل پہ اتنا قوی ہوتا ہے کہ کسی بھی مشکل کو کبھی خاطر میں نہیں لاتا ہے۔ ایک عالم اپنے علم سے، ایک فلسفی اپنے فلسفہ سے ایک تخلیق کار اپنی تخلیق سے اور ایک سالک کو خدا سے جتنی محبت ہوتی ہے اور اس محبت سے جو لذت حاصل ہوتی ہے اس کے مقابلے میں حیوانی خواہشات کی تکمیل سے حاصل ہونے والی لذتیں ہیچ ہیں۔ یہ تو ہمارے عام تجربے کی بات ہے کہ عشقِ مجازی میں گرفتار حضرات جو اپنے جذبوں میں سچے ہوں انہیں دنیاوی محبوب کے وصل کی ایسی طلب و شدت ہوتی ہے کہ وہ اس طلب و شدت میں خود سے بیگانے ہو جاتے ہیں۔ جب عشقِ مجازی کی قوت کا یہ حال ہمارے مشاہدے میں آتا ہے تو ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ لوگ جو عشقِ حقیقی میں گرفتار تھے یا ہیں اُن کی حالت و کیفیت کیا ہوگی۔ دراصل عشق ہی زندگی کا حسن اور اس کا جمال ہے۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق اپنی تصنیف "اقبال اور روحانیت" میں رقمطراز ہیں:۔

"کائنات کی دو مہیب طاقتیں ہیں علم و عشق۔ علم کا دائرۂ اثر آسمان تک ہے اور عشق کا لامکان تک۔ علم ایک تند و سرکش قوت ہے اگر اس کی زمام عشق کے ہاتھ میں نہ ہو تو یہ دنیا کے لئے لعنت بھی بن جاتا ہے":

یعنی انسانیت کا جوہر عشق ہے حضور علیہ صلوٰۃ والسلام نے ۲۷ مہمات میں حصہ لیا جس میں کفار کا جانی نقصان ۹۰۰ ہلاک اور مسلمانوں کا ۲۵۹ شہید تھا۔ یہ ہے کہ جب تلوار عشق کے ہاتھ میں ہوگی تو انسانیت میں اس قدر ڈوبی ہوگی کہ ایک ناحق قطرۂ خون تک زمین پر نہ ٹپکے گا۔

عشق میں عقل کی موشگافیوں کے لئے قطعی گنجائش نہیں۔ عشق نظر کے سامنے سے اسرار و رموز کے پردے ہٹا دیتا ہے۔ وہ ہر چیز میں ایک انفرادیت پیدا کرتا ہے عشق کے راستے میں کوئی شے رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ ثابت ہوا کہ عشق مادی نہیں روحانی قوت ہے۔ یہ انسان کے اپنے اندر سے جنم لیتا ہے اور وصل محبوب کا کرب اس کی غذا ہے جس سے یہ پھلتا پھولتا ہے اور بالآخر عرفان کی اُس منزل تک پہنچ جاتا ہے جہاں عبد و معبود ہم کلام ہوتے ہیں۔ کائنات کی تخلیق میں بھی ہمیں عشق کا یہی فلسفہ کارفرما نظر آتا ہے بقول غالب کے

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

عشق دراصل روح حقیقی کا جوہر ہے اس سے زندگی میں ایک خاص طرح کا ٹھہراؤ پیدا ہوتا ہے یقین محکم، سعی مسلسل اور جستجوئے حق زندگی کا لازمہ قرار پاتی ہے اور اس طرح بعد از موت زندگی کا کامل یقین ہوتا ہے۔

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ　　عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو　　عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

اور پھر

عشق کے خورشید سے شام اجل شرمندہ ہے　　عشق سوز زندگی ہے تا ابد پائندہ ہے

عشق جو ہمارے اپنے اندر سے جنم لیتا ہے دراصل ہمارے اپنے اندر اس کا اصل ماخذ ایمان ہے ایمان جتنا پختہ اور سچا ہوگا عشق اتنا ہی جوان اور توانا تر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا اور اسے لاشریک سمجھنا یہ سب عقل کی بنا پر نہیں ہے۔ اور نہ ہی کبھی اللہ تعالیٰ نے اپنا آپ ہمیں دکھایا ہے دراصل یہ وہ عقیدت، سچا عشق اور جذبہ صادق ہے جو ہمیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے جو کچھ کہا ہم نے بلا تردد مان لیا اور عشق کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ محبوب کی کامل اتباع کی جائے۔ وہ دن کو رات کہے تو "آمنا" اور رات کو دن کہے تو "صدقنا"،

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ط

اے رسولؐ آپ مسلمانوں سے کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کے طالب ہو تو میری اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا۔

روایت ہے کہ حضرت بایزید بسطامیؒ نے خربوزہ کھانے سے محض اس لئے انکار کر دیا تھا کہ انہیں نہیں معلوم تھا کہ رسول اللہؐ نے یہ پھل کس طرح کھایا ہے۔ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مرتدین و منکرین کے معاملے میں اسامہ بن زید کے لشکر کی روانگی کے معاملے میں جو اقدامات کئے وہ موجودہ صورت حال کے مطابق مصلحت کے قطعاً خلاف تھے۔ لیکن عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہنے پر مجبور کر دیا۔ اگر مدینے میں اس قدر سناٹا ہو جائے کہ بھیڑیئے آکر مجھے نوچنے لگیں جب بھی میں اپنے ارادے سے باز نہ آؤں گا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے ایک مسلمان کی گردن اس لئے اڑا دی کہ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کو تسلیم نہ کیا تھا۔ اور یہ امید لے کر عمرؓ کے پاس پہنچا تھا کہ وہ مسلمانوں کے معاملے میں خاصے جذباتی ہیں اس لئے یہودی کے مقابلے میں فیصلہ اس کے حق میں کر دیں گے۔ بلال حبشیؓ سرخ انگاروں پر چت لیٹے اَحد، اَحد کا ورد کرتے ہیں۔ یہ عشق کا دیا ضبط و حوصلہ نہیں تو اور کیا ہے بدر و حنین میں فرشتے مدد کے لئے اترتے ہیں۔ یہ صدائے عشق کا اعجاز نہیں تو اور کیا ہے معرکہ کرب و بلا میں نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنا خاندان کا خاندان کٹوا دیتے ہیں یہ مظاہرہ عشق نہیں تو اور کیا ہے۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق　　عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

فرانسیسی فلسفی ڈیکارٹ نے کہا تھا "میں سوچتا ہوں اس لئے میرا وجود یقینی ہے"۔

گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور　　چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

اگر اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر کوئی شخص یہ چاہے کہ وہ قرب خداوندی حاصل کرے گا۔ یا یہ کہ اس کی بخشش ہو

ہو جائے گی تو پھر یہ بکھرے

ایں خیال است و محال است و جنوں

عمر ہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

ترجمہ:۔ زندگی کعبہ و بت خانہ میں صدیوں تک مصروفِ آہ و گریہ رہتی ہے تب کہیں بزمِ عشق سے ایک دانائے راز باہر نکلتا ہے۔

اقبال کو ایک عاشقِ رسولؐ کی حیثیت میں دیکھتے ہوئے ہمیں اُن صفات کو مدِ نظر رکھنا ہے جو ایک عاشقِ رسولؐ کا معیار ہوتی ہیں۔ اقبال کے کلام کا بنیادی نقطہ توحید ہے۔ اقبال کا فلسفۂ توحید اس حقیقت کا غماز ہے کہ وہ مردِ حق تا دمِ آخر قرآن اور سنت کو اپنے سینے سے چمٹائے تاریکیوں میں توحید کی شمعیں روشن کرتا رہا اور وقت کے بڑے بڑے فرعونوں کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کیا۔ اقبال کے وقت کے فرعون ملحدانہ نظریہ ہائے حیات تھے۔ جو مسلمانوں کی رگوں میں سرایت کر رہے تھے۔ مسلمانوں کا اصلِ حیات صحیح اعتقادات ہیں وہ اس زہرِ ہلاہل سے اس قدر متاثر ہوتے ہوئے دکھائی دیتے تھے کہ لگتا تھا چند لمحوں میں یہ شیرازۂ حیات بالکل ہی بکھر جائے گا۔

لیکن اقبال کا درد فضاؤں میں گونجا

آہ! اے مردِ مسلماں تجھے کیا یاد نہیں حرفِ لاتدع مع اللہ الٰہاً آخر

اور پھر

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اور یہ کہ

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ الا اللہ

عاشقِ رسولؐ کے لئے بنیادی چیز اُس کا نظریۂ توحید پر مکمل اعتماد اور کامل یقین ہے اور علامہ مرحوم کے کلام کا مرکز بھی درس توحید ہے۔

رہے گا تو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا اتر گیا جو ترے دل میں لاشریک لہٗ

گو توحید کے اسی نکتے میں دراصل علامہ نے عرفانِ نفس کی تعلیم بھی دی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ اللہ کا خلیفہ اور نائب ہونے کی حیثیت سے مومن کو خود سے آگاہی حاصل ہونا چاہیے۔ اُسے اپنے مقام و مرتبہ اور ذمہ داری کا احساس ہو اور یہ ایک نفسیاتی حقیقت بھی ہے کہ جو لوگ اپنی صلاحیتوں اور قوتوں سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔ ان میں اعتماد اور یقینِ کامل پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر جو ذمہ داری اُن پر عائد کی گئی ہے یا جو ذمہ داریاں انہوں نے اُٹھائی ہیں اُن سے عہدہ برآ ہونے میں کسی بڑی سے بڑی رکاوٹ کو بھی وہ خاطر میں نہیں لاتے ہیں۔ اقبال یہی نکتہ سمجھاتے ہیں اور توحید کا یہی درس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو دیا ہے۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

اور یہ کہ

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

جاوید اقبال "مے لالہ فام" میں رقمطراز ہیں کہ اقبال کا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کے ساتھ عشق کا تو یہ عالم تھا کہ ہمارے لئے اس کا اندازہ لگا سکنا محال ہے۔

مشہور جرمن مستشرق ڈاکٹر این میری شمیل کے قول کے مطابق "اگر دیکھا جائے تو مسلمانوں کی دینی زندگی کا یقین بہت حد تک دو اصول کرتے ہیں ایک حرمت قرآن اور دوسرا عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم مسلمان رسول اللہ کی شفاعت پر کامل یقین رکھتے ہیں اس لئے صوفیائے کرام بھی اسی نتیجے پر پہنچے کہ محمد انسان کامل اور سرچشمۂ نور ہیں جس سے کل انبیاء وجود میں لائے گئے۔"

اقبال کے فکر کی اساس بھی یہی ہے۔

؎ سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

اسی لئے اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان میں ملتِ اسلامیہ کی شیرازہ بندی کے لئے رسول کریم کی ذاتِ اقدس ہی ہماری سب سے بڑی اور کارگر قوت ہو سکتی ہے۔"

دراصل یہاں پر جو چیز قابلِ غور ہے وہ یہ کہ اقبال کو رسول اللہ کی ذات مبارک سے عشق رسمًا یا تقلیداً نہیں تھا۔ بلکہ تحقیقاً تھا۔ اس لئے ایک جگہ لکھتے ہیں "شارع اُمّی نے وہ اصول بتائے ہیں کہ اُن کی ہمہ گیری کے سامنے حال کے مغربی فقہا کا تفقہ جس پر ہمارے لاکھوں وکیلوں اور بیرسٹروں کو ناز ہے ایک طفلِ مکتب کی ابجد خوانی معلوم ہوتی ہے۔"

'ما ہمہ یک مشتِ خاکیم او دل است'

ہم سب مشتِ خاک ہیں لیکن آنحضرت اس مشتِ خاک میں دھڑکتا ہوا دل۔

اقبال نے عشق و عقل کی گہرائیوں سے رسالتِ محمدی کی حقیقت و حیثیت کو سمجھ لیا تھا۔ اور اسی عشق و محبت نے آپ کے دل کو اتنا گداز اور پرسوز بنا دیا تھا کہ جب بھی آپ کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیا جاتا تو آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی ہے۔ آواز رندھ جاتی ہچکیاں بندھ جاتیں جذبات کی شدت سے آپ معمور ہو جاتے تھے بقول میر

جب نام تیرا لیجیے تب چشم بھر آوے　　　اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

علامہ مرحوم کی حکیمانہ سوچ نے یہ راز اچھی طرح جان لیا تھا کہ حُبِ نبوی مسلمانوں کے لئے لازمۂ حیات ہے چنانچہ انسانیت کی حقیقی تعمیر کا راز رسالت مآب کی ذات میں ہے۔

خیمۂ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے　　　نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے　　　دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

اقبال عاشقِ رسول ہی نہ تھے۔ بلکہ عاشقانِ رسالتِ مآب کے بھی عاشق تھے۔ صدیق اکبرؓ کی شان میں فرماتے ہیں۔

اے تجھ سے دیدہ ماہ و انجم فروغ گیر　　　اے تیری ذات باعثِ تکوینِ کائنات

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس　　　صدیقؓ کے لیے ہے خدا کا رسول بس

روزگار فقیر جلد دوئم میں علامہ کا کہا ہوا وہ فقرہ رقم ہے جو انہوں نے غازی علم الدین کی شہادت پر کہا تھا۔

"اسی گلاں کردے رہے تے ترکھاناں دا منڈا بازی لے گیا"۔

اسی طرح کراچی کے عبدالقیوم جس نے آریہ سماج حیدرآباد سندھ کے سیکرٹری نتھو رام کو "ہسٹری آف اسلام" نامی کتاب میں رسالت مآبؐ کی شان اقدس میں گستاخی کرنے کے جرم میں بر سرِ عدالت مقدمے کی کارروائی کے دوران چاقو سے قتل کر دیا تھا۔ جب اُس کے بارے میں ایک وفد نے علامہ سے ملاقات کی اور آپ کو اس سلسلے میں وائسرائے سے ملاقات کرنے کے لیئے کہا گیا تو آپ نے فرمایا۔ عبدالقیوم کی اس سلسلے میں کیا رائے ہے جب علامہ کو معلوم ہوا کہ وہ کہہ رہا ہے "میں نے شہادت خریدی ہے" تو تحت برہم ہوئے اور کہا

"جب وہ کہہ رہا ہے کہ میں نے شہادت خریدی ہے تو میں اُس کے اجر و ثواب کی راہ میں کیسے حائل ہو سکتا ہوں کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں ایسے مسلمان کے لئے وائسرائے کی خوشامد کروں جو زندہ رہا تو غازی مر گیا تو شہید ہے۔

علم الدین سے عبدالقیوم کے بارے میں آپ نے اشعار کہے۔

نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمانِ غیور		موت کیا شے ہے فقط عالمِ معنی کا سفر
ان شہیدوں کی دیت اہل کلیسا سے نہ مانگ		قدر و قیمت میں ہے خون جن کا حرم سے بڑھ کر

حضرت علامہ مرحوم حضور علیہ صلوٰۃ والسلام کے ظہور کو زندگی کا شباب قرار دیتے ہیں اور آپ کے جلوے کے بغیر زندگی کو ایک خواب بے تعبیر سمجھتے ہیں۔

اے ظہور تو شباب زندگی		جلوہ ات تعبیر خواب زندگی

علامہ کے نزدیک حقیقی فقر اور بادشاہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کے فیضان سے ہے۔ کائنات کی ساری تجلیاں آپ ہی کے جلوے سے مالا مال ہیں یہ آپ ہی کا فیض ہے کہ نوع انسانی کو انسانیت کی معراج نصیب ہوئی۔

فقر و شاہی وارداتِ مصطفےٰؐ		ایں تجلیہائے ذاتِ مصطفےٰؐ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ حضرت علامہ مرحوم کے عشقِ رسولؐ کے سلسلے میں ایک واقعہ بیان کرتے ہیں جو علامہ کے عاشق صادق ہونے کی دلیل ہے۔ ایک دفعہ پنجاب کے کسی رئیس کے گھر علامہ کا قیام رہا۔ جب وہاں پہنچے تو اُس رئیس نے آپ کے بلند مرتبے کے احترام میں آپ کی خوابگاہ کو بہت پُر تکلف رکھا۔ علامہ جب خوابگاہ میں داخل ہوئے اور بستر پر لیٹے تو فوراً ہی بے چین ہو کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ دل میں یہ خیال آیا کہ جس ذات عظیم کے طفیل آج یہ مقام ملا ہے وہ تو کبھی ایسے آرام دہ بستر پر نہیں لیٹا۔ یہ خیال آنا تھا کہ آنکھوں سے جھڑی لگ گئی۔ اپنے ملازم علی بخش کو بلایا اپنا بستر منگوا کر اسی کمرے سے ملحق غسل خانے میں لگوایا اور جب تک وہاں رہے غسل خانے ہی میں قیام فرمایا۔

"روزگار فقیر" میں فقیر سید وحید الدین تحریر فرماتے ہیں۔" اقبال کی شخصیت صاحب کردار انسان اور راسخ العقیدہ مسلمان کی حیثیت سے بھی اُسی رفعت اور بلندی پر نظر آئے گی جو عظمت و امتیاز اُسے بحیثیت فلسفی شاعر اور دانائے راز حاصل ہے۔ یہ زندگی جابجا ایسی جھلکیوں سے آراستہ اور ایسی مثالوں سے پیراستہ ہے جو عاشقانِ رسولؐ اور شیدائیانِ اسوہ حسنہ کا خاصہ ہو سکتی ہے"۔

وہ ایسے مسلمان تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاکِ پا کو سرمۂ چشمِ بصیرت اور اکسیر و کیمیا سمجھتے تھے۔ اُن کا دل گداز اور ضمیر بیدار تھا۔

برٹرینڈ رسل جیسا منکرِ خدا بھی یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو گیا کہ "زندگی میں لطف و قدرت پیدا کرنے والی دو ہی اقدار ہیں ایک علم اور دوسرا عشق"

اقبال جن کے فلسفے کا مرجع و مرکز ہی عشق ہے یہ کہتے ہیں۔

شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام　　شورشِ طوفان حلال لذتِ ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال عشق پہ حاصل حرام　　علم ہے ابن الکتاب عشق ہے ام الکتاب

عشقِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی رو میں بہہ کر اقبال یہاں تک فرما گئے۔

می تواں منکر یزداں شدن　　منکرِ شانِ نبیؐ نتواں شدن

ترجمہ:- تو کسی نہ کسی طرح خدا کا منکر تو ہو سکتا ہے لیکن شانِ نبی کا منکر نہیں ہو سکتا۔

دراصل یہاں اقبال نے خدانخواستہ شرک نہیں کیا ہے یا شانِ نبیؐ کو شانِ خداوندی پر فوقیت نہیں دی ہے بلکہ ایک تاریخی حقیقت کو واضح کیا چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم جیسے انسانوں میں تشریف لائے۔ آپ کے شب و روز آج بھی جوں کے توں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ اندرونِ خانہ سے لے کر بیرونِ محفل تک آپؐ کی ذاتِ بابرکات کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو ہمارے علم میں نہ ہو ایسی صورت میں شانِ نبوی کا کوئی کیونکر منکر ہو سکتا ہے۔ جبکہ خداوند تعالےٰ کی ذات تو ہزار پردوں میں مستور ہے۔

اور یہی وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر حضرت علامہ مرحوم ختمِ نبوت کے سلسلے میں یہ دلیل لاتے ہیں کہ "محمدؐ پر نبوت اس لئے ختم ہو گئی کہ انہوں نے انسانیت کو ایک ایسا نظامِ زندگی دیا جو خالصتاً فطرت پر مبنی تھا، علامہ اپنے ہی ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں۔ "البتہ ایک ہستی ضرور ایسی گذری ہے جس نے خود ہی ایک نظریہ پیش کیا اور خود ہی اُس کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا جانتے ہو وہ کون تھی وہ محمد عربیؐ تھا یا پیر موسیٰ۔

حق گوئی و بیباکی پیغمبرانہ صفات ہیں ایک عاشقِ صادق کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے محبوب کی مکمل اتباع کرے علامہ مرحوم اس میدان میں بھی کہاں پیچھے ہٹ سکتے تھے۔

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے　　جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا

علامہ نے بھی اتباعِ سنت کرتے ہوئے حق بات کہنے سے کبھی دریغ نہ کیا یہ اُس مردِ آہن کی ضرب کاری ہے جس نے عشقِ رسولؐ میں ڈوب کر بانگ دہل یہ کہہ دیا۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی　　یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

جس طرح رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصر و کسریٰ کی تباہی کا اعلان فرمایا تھا۔ اُن کا عاشقِ صادق بھی اُن کے مقدس قدموں کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے اعلان کرتا ہے۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی   جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

باوجود اس کے کہ بیرسٹر تھے اور کوئی معمولی بیرسٹر نہیں اور پھر اس کے ساتھ ساتھ مغربی و مشرقی فلسفہ و علوم پر دسترس رکھتے تھے چاہتے تو دولت کے انبار جمع کر لیتے لیکن سمجھتے تھے کہ منزلِ عشق میں یہ بے ادبی اور گستاخی ہوگی کہ اس راستے کو اختیار کیا جائے جو محبوب کا راستہ نہیں تھا۔ یہاں بھی سنت کی پیروی کی اور قناعت کو زندگی کا مرکز بنایا۔

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے   خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

اور آخر ایسا کیوں نہ کرتے جبکہ عشقِ رسولؐ میں سینہ و دل اس قدر گداز تھے کہ مرزا جلال الدین صاحب بیرسٹر روایت کرتے ہیں۔

"میرے پاس ریاست ٹونک کا ایک ملازم تھا وہ مسدس حالی ستار پر ایک خاص طرز کے ساتھ سنایا کرتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب التزام کے ساتھ ہر دوسرے تیسرے روز اس سے مسدس سننے کی خواہش کرتے اور بطورِ خاص جب وہ اس بند پر پہنچتا۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا   مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

تو اقبال بے اختیار ہو جاتے اور رو پڑتے۔

یوں بے اختیار ہو جانا محبوب کا نام آتے ہی جذبات پہ قابو نہ رہنا سوز و غم سے تڑپ تڑپ جانا یہ سب کچھ یوں ہی نہیں تھا۔ کتنے ہیں جو رسول اللہ کے نام پر یوں بے اختیار ہو جاتے ہیں۔ در اصل یہ تو اُن ہی کی شان ہے جو واقعی عشق رسول میں اپنا سب کچھ گنوا بیٹھے ہوں جن کی سوچوں کا مرکز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ ہو۔ جو ایک نظر گنبدِ خضرا کو دیکھنے کے لئے اپنی سب متاع لٹا دینے کو تیار ہوں۔

عبدالرحمان طارق "جوہرِ اقبال" میں رقمطراز ہیں "سردیوں کے دن تھے۔ آپ برآمدے میں بیٹھے دھوپ سینک رہے تھے۔ طبیعت پر ایک کیف و وجد کا عالم طاری تھا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ رہی تھی۔ آسمان کی طرف بار بار انگشتِ شہادت اٹھاتے تھے۔ اور بھرائی ہوئی آواز میں یہ شعر پڑھ رہے تھے۔"

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر   نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

ترجمہ:۔ "آسمان کے نیچے ایک ایسی ادب گاہ ہے جو عرش سے بھی نازک تر ہے۔ یہاں تو جنید اور بایزید جیسی بزرگ ہستیاں بھی سانس گم کئے ہوئے حاضر ہوتی ہیں۔

محبت جب اپنے درجہ کمال کو پہنچتی ہے تب محب، محبوب کی ذات میں اس قدر مدغم ہو جاتا ہے کہ اُسے ہر شے اپنے محبوب کا پرتو نظر آتی ہے۔ اُس کے دل سے پھوٹنے والے محبت کے چشمے بڑی تیزی اور روانی سے صرف محبوب کے رخ پر ہی بہتے ہیں۔ اُس کی تمام تر کاوشوں کا محور اور خوشنودی کا حاصل صرف اور صرف محبوب کی رضا ہوتی ہے۔ اقبال کا فلسفۂ عشق رسولؐ اللہ سے محبت اور پھر اس کا والہانہ انداز بیان اس حقیقت کا مظہر ہے۔ اقبال کی شاعری عام روایتی شاعری نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر اس خدشے کا اظہار کرتے تھے کہ قوم انہیں محض شاعر سمجھ کر ان کے کلام کو ضائع نہ کردے۔ خود کہتے ہیں۔

میری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ   کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

جناب ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اپنی تصنیف "فکرِ اقبال" میں رقمطراز ہیں۔

"اقبال کے نزدیک عشق کی بہترین مثال رسولِ کریمؐ کی زندگی ہے جس میں خلوت و جلوت کا توازن پایا جاتا ہے۔ عقل جلوت کی طرف کھینچتی ہے عشق خلوت کی جانب لیکن زندگی کی تکمیل دونوں کے توازن سے ہوتی ہے۔"

اس مقالے میں آگے چل کر محترم مقالہ نگار تحریر فرماتے ہیں۔

"عشق انسان کے اندر بصیرت و قوت دونوں کا اضافہ کرتا ہے اُسے ایسی حقیقت سے آشنا کرتا ہے۔ جو زمانی اور مکانی نہیں۔"

اور واقعی اقبال کے بصیرت افروز مضمون اُس کی الہامی کیفیات کے غماز ہیں۔ عشقِ حقیقی نے جو حسرت اور تڑپ اُس کے کلام میں پیدا کی وہ قاری پر براہ راست اثر انداز ہوتی ہے بقول غالب

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی۔

دراصل یہ سیرت پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے مطالعہ کا اعجاز ہے۔ قرآن کے شعور و فہم کا کمال ہے کہ اقبال کو یہ مرتبہ بلند ملا جو آج وہ عاشقانِ رسولؐ کی صف میں ہمیں نظر آتے ہیں۔

اپنی نظم شفاخانۂ حجاز میں دل کی بے قراری اور سرزمینِ حجاز میں مرنے کی طلب کرتے ہوئے خود کو دیوانۂ حجاز کہتے ہیں۔ اور ایک پیشرو اپنے قوم کی طرف سے خود سے سوال کرتے۔ ذرا دستِ جنوں بڑھا شفاخانے کی تعمیر کے سلسلے میں مدد کر اقبال کا جواب ملاحظہ ہو۔ سبحان اللہ بندۂ مومن کی یہی شان ہوتی ہے۔

میں نے کہ موت کے پردے میں ہے حیات	پوشیدہ جس طرح ہو حقیقت مجاز میں
تلخ بہ اجل میں جو عاشق کو مل گیا	پایا نہ خضر نے مئے عمرِ دراز میں
اوروں کو دیں حضور یہ پیغامِ زندگی	میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں
آئے ہیں آپ لے کے شفا کا پیام کیا	رکھتے ہیں اہلِ درد مسیحا سے کام کیا

جاوید اقبال لکھتے ہیں:۔

"میں نے اماں جان کی موت پر بھی اُنہیں آنسو بہاتے نہیں دیکھا مگر قرآن مجید سنتے وقت یا کوئی شعر پڑھتے وقت یا رسول اللہ کا اسم مبارک نوکِ زبان پر آتے ہی اُن کی آنکھیں بھر آتی تھیں۔"

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّالِدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ

تم میں سے کوئی شخص سچا مومن نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ میں اُس کے نزدیک اُس کے والدین اور دُنیا کے تمام لوگوں سے زیادہ محبوب اور محترم نہ ہو جاؤں۔ (حدیث از بخاری شریف)

رسول اللہ سے علامہ کے عشق کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ جب آپ سے خدا کے وجود کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے بے دھڑک یہ کہہ دیا۔ "یہ بات ہم نے محمدؐ سے سُنی ہے اور آپؐ نے اپنی زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا۔"

اس طرح ایک دفعہ دیدارِ رسولؐ کے بارے میں پوچھا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا کہ سنتِ نبویؐ کی پیروی کرو اور

حبیب رسول پاک کی سیرت پر عملاً کاربند ہو جاؤ تو خود کو دیکھو یہی دیبا رہے۔

اقبال ارتقائے انسانی کے لئے عشقِ رسولؐ کو ضروری امر سمجھتے ہیں آپ کہتے ہیں کہ دنیائے رنگ و بو میں پھیلے ہوئے مظاہرِ فطرت کی تابانی یہ عشق و مستی سوز و ساز یہ سب رسالت مآبؐ کے انوارِ مبارکہ کے مظہر ہیں۔

می ندانی عشق و مستی از کجاست
این شعاعِ آفتابِ مصطفیٰ است

سچا عشق جذبۂ صادق سے جنم لیتا ہے اور عاشقِ صادق وہ ہے جو معشوق کی ایک ایک دھڑکن سے کما حقہٗ واقف ہو جس کے لب ترانۂ محبوب کے سوا کچھ اور گنگنا ہی نہ سکتے ہوں اور یہی وہ منزل ہے جہاں تکمیلِ ذات ہوتی ہے۔ ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی اپنی تصنیف "اقبال اور محبت رسولؐ" میں تحریر فرماتے ہیں۔

"عشق تکمیلِ ذات کے لئے تسخیری عمل پر مستعد رکھتا ہے اس لئے تمام فطری اور عمرانی رکاوٹوں پر غالب آتا ہے۔ یہ عشق کا جذبہ حُبِّ خدا اور حبِّ رسولؐ سے میسّر آتا ہے۔"

اقبال بھی تکمیل ذات کے اس سفر میں اُس منزل پر پہنچتے ہیں کہ عشق پکار اٹھتا ہے۔

غم راہی نشاط آمیز تر کن — (اے ساربانِ راہِ حجاز!) اِس راہی کے غم میں زیادہ خوش کر

فغانش را جنوں آمیز تر کن — اِس کی آہ و فغاں میں کچھ اور جنونِ عشق شامل کر

بگیر اے ساربان راہ درازے — اے ساربان منزلِ محبوب کی جانب کو "راہ دراز" اختیار کر

مرا سوزِ جدائی تیز تر کن — اور اس طرح میرے سوز و جدائی کو اور بھی تیز کر دے

اقبال کا فلسفۂ خودی، اقبال کا مردِ کامل، اقبال کا شاہین، اقبال کا فلسفۂ عشق، اقبال کا تصورِ مومن، اقبال کا فلسفۂ حیات غرضیکہ اقبال کی تمام تر شاعری کو یکجا کیا جائے تو اس دیوان کے منقش در و دیوار۔ اس بہتے ہوئے قلزمِ خیر کا منبع و مرکز، یہ رات کی تاریکی میں دیوانِ اقبال سے پھوٹتی ہوئی کرنیں یہ سحر آفریں صدائے درا یہ اسرارِ خودی، یہ رموزِ بے خودی، یہ ارمغانِ حجاز یہ عجمی سرزمین حجاز کا مغنی یہ کون ساحر تھا جو اُس نے پھونکا یہ کون سا کرشمہ تھا جو اُس نے دکھایا تو ہم یہ کہیں گے کہ یہ تمام فیوض و برکات یہ سب عشق و رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی دین ہے۔ یہ عشق۔ یہ سوز اور یہ کرب اُن کے دل میں پلتا رہا۔ اور بالآخر انہیں اس منزل پر لے گیا جہاں سے دل و دماغ کو علم و عرفان کی روشنی ملتی ہے جہاں پہنچ کر عشق کی تڑپ جذب کی کیفیت میں ڈھل جاتی ہے اور اور یہ وہی مقامِ شوق ہے جہاں عقل و خرد سے بیگانہ ہو کر اگر منصور "انا الحق" کا نعرہ مستانہ بلند کر دے تو بعید نہیں۔

بلغ العلےٰ بکمالہٖ — کشف الدجیٰ بجمالہٖ

حسنت جمیع خصالہٖ — صلو علیہ و آلہٖ

اختر شیرانی اور جدید ادب

مصنفہ : ڈاکٹر یونس حسنی

اقبالؒ اور تعلیم

نوید ظفر

تعلیم مشتق ہے علم سے اور علم بنیاد ہے تمام انقلابات کی۔

کائنات کی ابتدا علم اسماء سے ہوئی، اور اس کے بعد مرتب ہونے والی ہر تبدیلی کا محرک علم قرار پایا۔ تاریخ عالم کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر انقلاب جو کامیاب ہوا اس کی پشت پر کسی فلسفی کی فکر اور اس کے جلو میں کسی مردِ جری کی آہنی تنظیم تھی۔ ان دو عوامل میں سے ایک کی عدم موجودگی میں مرتب ہونے والا انقلاب یا تو شرمندۂ تعبیر ہی نہ ہو سکا اگر ہوا تو ناکام رہا۔

اسپین جہاں مسلمانوں نے سات سو برس حکومت کی، کسی فلسفی کی انقلابی سوچ کو اساس نہ بنا سکا۔ آج وہاں اسلام کا نام بھی مفقود ہے۔ جبکہ لاہور محمود غزنوی کی آبدار تلوار تلے علی ہجویری کی تعلیمات سے منور ہوا۔ تو پھر کسی موجد ظلمات سے متزلزل نہ ہوا۔ فرانس میں والٹیر کی تعلیمات جب نپولین کی عسکری صلاحیتوں میں منتج ہوئیں تو ۱۷۹۳ء انقلابات کی تاریخ میں سنگِ میل قرار پایا۔ روس میں مارکس کا فلسفہ لینن کی تنظیم میں ڈھلا تو شفق پر سرخی کا پھریرا لہرایا۔ چین میں ماؤ کے اشعار جو این لائی کے تدبر میں نمودار ہوئے تو ہمارے چشمے ابلنے لگے، اور جب برِ صغیر میں اقبال کا ترانہ جناح کی فراست سے بانگِ درا بن کر گونجا تو انگریز کی عیاری اور ہندو کی ریشہ دوانی کے باوجود ایک اسلامی سلطنت کا وجود میں آنا ناگزیر ٹھہرا۔

اقبال جو مورخ بھی تھا اور فلسفی بھی، شاعر بھی تھا قلندر بھی۔ اپنے مطالعہ اور مشاہدے کی بنیاد پر تاریخ کی ان گہرائیوں میں اترا۔ جہاں سے برآمد ہونے والے غواص آبدار موتی جھولیاں بھر کر لاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار لب و رخسار اور مینا و قلقل تک محدود نہ رہے بلکہ ایک قوم کو خوابِ گراں سے بیدار کرنے کا سبب بنے۔ اس حقیقت کا اظہار وہ خود یوں کرتے ہیں۔

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو — لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند
تاثیر ہے یہ میرے نفس کی کہ خزاں میں — مرغانِ سحر خواں مری صحبت میں ہیں خورسند
لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے — جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

حقیقت میں اقبال کی فکر کا مرکز اپنے دیس کے بندوں کو غلامی کی رضامندی سے باہر نکالنا تھا۔ ضربِ کلیم میں فرماتے ہیں:۔

کیا گیا ہے غلامی میں مبتلا تجھ کو — کہ تجھ سے ہو نہ سکی فقر کی نگہبانی

غلامی کی ابتلا سے آزادی حاصل کرنے کے لئے وہ اپنی قوم کو فعال ہونے کی سوچ دیتے ہیں۔

گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی — اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

کبھی وہ اپنی قوم کی بے حسی پر ملامت کناں ہیں:۔

ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے درد دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام

کبھی ان کی نگاہیں اس مہدیٔ برحق کو تلاش کرتی ہیں جو اس صورت حال سے نجات دلا سکے۔

دنیا کو ہے اس مہدیٔ برحق کی ضرورت ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار

اور کبھی وہ اپنے دکھوں کو اشکوں میں ڈھال کر بارگاہِ رسالت میں فریاد کناں ہیں:۔

اس راز کو فاش کر اے روحِ محمدؐ آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

غرض اپنے دیس کے بندوں کو غلامی سے بیدار کرنے کے لئے اقبال کا کلام ایک جہدِ مسلسل ہے۔

یہ ان کا نصیب تھا کہ انہیں مشرقی اور مغربی ہر دو علوم دیکھنے اور پرکھنے کا موقع ملا۔ یہ ان کا اعجاز تھا کہ انہوں نے اس کے مطالعہ سے اپنی قوم کے درد کی تشخیص کی۔ یہ ان کی تشنگی تھی جو انہیں علومِ شرقی سے دنیائے غرب میں لے گئی لیکن یہ ان کی تحقیق تھی کہ ہر دو علوم کا موازنہ انہیں اپنے اسلاف کی جانب ہی لے آیا اور شاعرِ المانوی سے متاثر ہونے والا اقبال بالآخر پیرِ رومی کی درگاہ میں قرار پا گیا۔

علم ایک اکائی ہے اس کا کوئی حدود اربعہ نہیں۔ مذہب، معاشرہ، تربیت کوئی بند اس کے سیلِ رواں کی راہ میں نہیں رکتا۔ علم وہ واحد کسوٹی ہے جو انسان کو حیوان سے ممیز کرتی ہے۔ شعورِ ذات اور ادراکِ خودی سے آگاہ کرتی ہے۔ اسی شعورِ ذات سے وہ ستاروں پر کمندیں ڈالتا ہے۔ اور اسی ادراکِ خودی سے جہانِ نو پیدا کرتا ہے۔

وقت کے مد و جزر سے تلاشِ علم کے راستے بھی روشن ہوئے۔ زمانہ قدیم کے طالب علم برسوں کی دشت نوردی اور آبلہ پائی کے بعد جو مراحل طے کرتے تھے آج ایک اوسط بچہ انہیں اپنے مکتب کے ابتدائی ایام میں سمجھ لیتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود تعلیم مکتب تک ہی محدود نہیں۔ اقبال کی سوچ اس بارے میں آج بھی انقلابی ہے۔

اقبال کے فلسفہ کی روشنی میں آغازِ تعلیم سے بھی پہلے ایک اہم تر مرحلہ اور ہے۔ یہ مرحلہ تربیت کا ہے جو روایتی پند و نصائح اور تاریخی روایات کی داستانیں ذہن نشین کرانے سے نہیں، ذوقِ سلیم پیدا کرنے سے حاصل کی جا سکتی ہے جو بچے کے ذہن میں وہ معیار قائم کر دے کہ وہ از خود کھرے اور کھوٹے میں تمیز کر سکے۔ حقائق کے اظہار سے مبہوت نہیں، ان کی تہہ تک اتر سکے۔

وہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آدابِ فرزندی

"فیضانِ نظر" اقبال کے فلسفۂ تعلیم میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنے دیس کے چمن میں غنچوں کی تربیت کے لئے وہ اسے شبنم سے تعبیر کرتے ہیں۔

چمن میں تربیتِ غنچہ ہو نہیں سکتی نہیں ہے قطرۂ شبنم اگر شریکِ نسیم

اپنے ہم وطنوں کی نگاہوں سے غلامانہ روش جھٹکنے کے لئے وہ اسے بندۂ حُر کے مشاہدات کا نام دیتے ہیں۔

جہاں میں بندۂ حر کے مشاہدات ہیں کیا تری نگاہ غلامانہ ہو تو کیا کہیے

جوانوں سے گفتگو کرتے وقت پیرِ حرم سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:۔

اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت دے ان کو سبق خود شکنی کا، خود نگری کا

میدانِ نظر کی مختلف تراکیب سے مکمل کلامِ اقبال عبارت ہے اس لئے کہ منزلِ مقصود کا سراغ اس کے بغیر ناممکن ہے۔

ملے گا منزلِ مقصود کا اسی کو سراغ
اندھیری شب میں ہے چیتے کی آنکھ جس کا چراغ

چنانچہ اقبال نے اپنا کلام سمجھنے اور پرکھنے کی شرطِ اوّلیں بھی "نظر" ہی قرار دی ہے۔

نظر نہیں تو مرے حلقۂ سخن میں نہ بیٹھ
کہ نکتہ ہائے خودی ہیں مثالِ تیغِ اصیل

لیکن اقبال حقائق کی دنیا سے غافل نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ موجودہ دور کا نوجوان یہ جنسِ گرانمایہ کسی قیمت پر کسی ادارے سے حاصل نہیں کر سکتا۔

اہلِ دانش عام ہیں کمیاب ہیں اہلِ نظر
کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ

مدرسہ دورِ حاضر کی درسگاہِ علوم، اپنے طالب علموں کو خرد کی گتھیاں سلجھانے میں معاونت تو کر سکتا ہے نگاہِ مسلماں کو تلوار نہیں کر سکتا۔

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مکتب کا طالب علم اس نظریہ یا نظریہ کو حاصل کرنے میں کیوں کامیاب نہیں ہوتا جس کا حصول ہی اقبال کے ...ل تعلیم ہے، اس کا جواب بھی اقبال ہی مہیا کرتے ہیں۔

گرچہ مکتب کا جواں زندہ نظر آتا ہے
مردہ ہے مانگ کے لایا ہے فرنگی سے نفس

گویا مکتب سے اقبال کی مکمل بیزاری کا واحد سبب فرنگی نظریۂ تعلیم ہے۔ اس بدیسی نظریے کے مقابلے میں وہ اپنے علوم اور مشرقی روایات کی ترویج کا اظہار کرتے ہیں جو ان کے نزدیک اس دور کو باوجود مغربی مادی ترقی کے ہنوز روشنی بخش سکتی ہے۔

رکھتا ہے اب تک مے (خانۂ) شرق
وہ مے کہ جس سے روشن ہو ادراک

موجودہ درس و تدریس اور نظامِ تعلیم اقبال کے نزدیک طلباء شرق پر حقائق آشکار کرنے کے بجائے ان کی آنکھوں پر پردے گراتے ہیں کہ کہیں وہ اپنی حقیقت سے آگاہی نہ حاصل کر لیں۔ اس پہلو سے اقبال مکتب کو مے کدہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

مکتب و مے کدہ جز درس نبودن ندہند
بودن آموز کہ ہم باشی و ہم خواہی بود

مدرسے سے اقبال کو شکایت ہے کہ وہ طالب علم کو زورِ حیدرؓ فقرِ بوذرؓ اور صدقِ سلیمانیؓ سے آگاہ کرنے کے بجائے فکرِ ...ش میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اور اس تعلیم سے روشناس کراتا ہے جو کسبِ معاش کی دوڑ میں اسے مہمیز دے۔

وہ علم نہیں زہر ہے احرار کے حق میں
جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کفِ جو

گویا اقبال کی خواہش ہے کہ اس کے جوانوں کی تربیت اس طرح ہو جو انہیں مبتلائے روزگار کرنے کے بجائے فقر و استغنا سے ہمکنار کر دے یہ جوہر مغرب سے مستعار نہیں لیا جا سکتا بلکہ خود اپنی ذات سے پھوٹتا ہے۔

ادھر نہ دیکھ ادھر دیکھ اے جوانِ عزیز
بلند زورِ دروں سے ہوا ہے فوارہ

زورِ دروں سے اقبال کی مراد عرفانِ ذات ہے وہ مغرب کی روشنیوں سے چکاچوند نہیں ہوتا بلکہ اس بات کا خواہاں ہے کہ اس کے طالب علم اگر اپنی تلاش کا خود گمان حاصل کر لیں تو پھر روشنی انہی سے پھوٹے گی، جو بدیسی اقوام کو بھی ان کی جانب متوجہ کر دے گی۔

دیکھے تو زمانے کو اگر اپنی نظر سے　　افلاک منور ہوں ترے نورِ سحر سے

حصولِ نظر کا یہی فلسفہ اقبال کے شہرۂ آفاق نظریۂ خودی کی بنیاد ہے۔

اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی　　کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی

خودی کا یہی تصور جب فیضانِ نظر میں جلا پا کر ابھرتا ہے تو پھر اقبال کے نزدیک:

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی　　ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

خودی اور فیضانِ نظر وہ دو ہتھیار ہیں جن سے مسلح ہونے کے بعد ایک فرد یہ تاریخ مرتب کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

تو اپنی سرنوشت اب اپنے قلم سے لکھ　　خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں

اقبال کا طالب علم فیضانِ نظر وہ دو ہتھیار ہیں جن سے مسلح ہونے کے بعد ایک فرد یہ تاریخ مرتب کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

تو اپنی سرنوشت اب اپنے قلم سے لکھ　　خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں

اقبال کا طالب علم فیضانِ نظر اور خودی سے بہرہ ور ہونے کے بعد پہلی خواہش مکمل آزادی کی چاہے گا۔ اس لئے کہ فرد اپنے جوہر کی تلاش اس وقت تک کر ہی نہیں سکتا جب تک وہ مادی، ذہنی، فکری اور جسمانی آزادی سے پوری طرح آشنا نہ ہو:

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب　　اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

اپنے اسی فلسفے کی روشنی میں اقبال نے اپنی قوم کو آزاد دیکھنے کی خواہش کی تھی، اپنے کلام میں وہ برابر اپنی خوابیدہ قوم کو بیدار اور آزادی کے لئے ہنگامہ آرا کرتے نظر آتے ہیں۔

مسلم خوابیدہ اٹھ ہنگامہ آرا تو بھی ہو　　وہ چمک اٹھا افق گرمِ تقاضا تو بھی ہو

اقبال کے نزدیک یہ دنیا تو ہے ہی آزاد قوموں کا گھر، انہی کی گفتار یہاں سند ہے۔ انہی کی سوچ قابلِ تقلید۔ غلام اقوام اپنی گھٹن میں اپنی بصیرت پر خود بھروسا نہیں کر سکتے۔ اس سے نتائج کیسے مرتب کریں۔

بھروسا کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر　　کہ دنیا میں فقط مردانِ حر کی آنکھ ہے بینا

آزادی کا تصور اجاگر کرتے ہوئے اقبال عام سوچ سے ایک قدم مزید آگے بڑھاتے ہیں کہ آزادی و محکومی کا تصور صرف زندگی تک ہی محدود نہیں، یہ تفاوت ان کے اسلامی عقائد کی روشنی میں مابعد زندگی بھی ہے۔ چنانچہ ان کے الفاظ میں ایک قبر اپنے محکوم مکین سے یوں گلہ کرتی ہے۔

آہ ظالم تو جہاں میں بندۂ محکوم تھا　　میں نہ سمجھی تھی کہ ہے کیوں خاک میری سوزناک

آزادی کی اہمیت اس قدر واضح کرنے کے بعد اقبال یہاں بس نہیں کرتا بلکہ اپنے مبتدی کو اس مقام سے آشنا کرتا ہے جو آزادی سے بھی زیادہ اہم ہے۔

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت　　ہے ایسی تجارت میں مسلماں کو خسارا

گویا اقبال کے حلقۂ سخن میں بیٹھنے کی شرطِ اول اگر فیضانِ نظر ہے تو اس کی انتہا اکتسابِ دین ہے، اور اقبال کا

تمام نظامِ تعلیم اسی سلیبس سے آراستہ ہے۔ اسی کے حصول کے لئے وہ شہروں سے بَن اچھے سمجھتا ہے اور اسی تلاش میں وہ شیخ مکتب سے عرض کرتا ہے۔

اے شیخ بہت اچھی مکتب کی فضا لیکن بنتی ہے بیاباں میں فاروقی و سلیمانی

اس مقام پر وہ خرد اور عشق کے رموز سے آگاہ کرتے ہیں اور راہِ فکر کی موشگافیوں سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں:۔

خرد کی تنگ دامانی سے فریاد تجلّی کی فراوانی سے فریاد

گوارا ہے اسے نظارۂ غیر نگہ کی نامسلمانی سے فریاد

خرد کی اسی تنگ دامانی کا علاج وہ قرآن حکیم کی تعلیمات و تجلّیات میں تلاش کرتے ہیں۔

لا دینی و لاطینی کس پیچ میں الجھا تو دارو ہے ضعیفوں کا لاغالب الّا ہو

پس اقبالؔ کی تعلیم کا مرکز دین ہے۔ اگر ان کا طالب علم اصل مرکز سے غافل نہ ہو تو پھر زمانہ چاہے کسی انداز میں معلّم ہو طالب علم اپنی راہ میں گم نہیں کرتا۔ جوہر میں ہو لا الٰہ تو کیا خوف / تعلیم ہو گو فرنگیانہ

اقبال کا یقینِ خدا اس قدر واضح اور راسخ ہے کہ جب وہ لینن کے بارے میں سوچتا ہو تو اسے بھی خدا کے حضور لے جاتا ہے اور اس کی زبان سے کہلواتا ہے۔

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات

تیقن کے اس مقام سے اقبالؔ عندلیب حجاز کے مانند جب بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوتا ہے تو تمام دین اسے وہیں نظر آتا ہے:۔

بمصطفےٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

غرض اقبالؔ کا نظامِ تعلیم علم اور فقر دونوں کے اجتماع اور دونوں کے حصول کا نام ہے؛ اور اس کی تلاش نظر، خودی اور آزادی سے ہی ممکن ہے؛ مدرسہ کی سربلندی کے لئے اقبال کا کہنا ہے:۔

کہتے ہیں فاش رموزِ قلندری میں نے کہ فکرِ مدرسہ و خانقاہ ہو آزاد

انہی رموز کی مزید وضاحت کے لئے وہ پیرِ رومی سے دستگیری حاصل کرتا ہے اور علم اور اکتسابِ علم کی تعریف مثنوی کے ان اشعار سے کرتا ہے:۔

علم را بر تن زنی مارے بود علم را بر دل زنی یارے بود

یہ علم اور دل کے اسی تعلق کا اثر ہے کہ اقبال جب اپنے مدرسے کے دروازے کھولتا ہے تو طبلِ جنگ کی طرح گھنٹی بجاتا نظر نہیں آتا، بلکہ نہایت عجز اور متانت سے رہ نوردانِ شوق کو دعوتِ علم دیتا ہے۔

بیا بمجلسِ اقبالؔ و یک دو ساغر کش کہ گرچہ سر نتراشد قلندری داند

اقبال، اسلام اور اشتراکیت

دردانہ جلیل ایم۔ اے

جب بھی بات سیاست پر ہوگی تو مختلف نظریہ ہائے فکر کے بانیوں کا ذکر ضرور آئے گا سقراط ہوں یا افلاطوں، کنفیوشس ہو یا روسو، مسولینی ہو یا کارل مارکس۔ گو کہ عوام کو ان کے حقوق دینے کے متعلق ان سب کے نظریات دیانتداری پر مبنی تھے مگر ان میں سے کسی کا نظریہ بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ ان کو رواج دیتے وقت ذاتی غرض اور ذاتی مفاد ہر لیڈر کے دماغ میں کسی نہ کسی چور دروازے سے داخل ہوتا رہا۔ بڑی بڑی احتیاط کے باوجود یہ تمام کے تمام نظام غیر فطری ثابت ہوئے۔ آج دنیا دو بڑے حصوں میں تقسیم نظر آتی ہے اشتراکی بلاک، اور سرمایہ داری بلاک کے باہم کبھی پوشیدہ اور کبھی علانیہ طور پر برسرِ پیکار ہیں۔ امن پسند افراد کی سہمی ہوئی نظریں انجام کی منتظر ہیں دو ہولناک عالمی جنگیں بھی کسی کی برتری ثابت نہ کر سکیں۔ اس مہذب اور متمدن دور میں سوائے اقبال کے کوئی اور نظر نہیں آتا جو کسی مثالی سیاست کا تصور پیش کرتا ہو۔ اقبال نے کوئی نئی بات نہیں کہی ہے بلکہ بھولی ہوئی بات یاد دلائی ہے کسی نظریہ سے اختلاف اور بات ہے مگر کوئی اور نظریہ پیش کرنا اور بات۔ وہ بھی مدلل اور دلنشین و دلپذیر انداز میں اقبال نے اسلامی نظام کی حمایت اس لئے نہیں کی کہ وہ مسلمان تھے ذکنس کے نام تمام خط اس کے گواہ ہیں۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ اقبال کی علمی قابلیت کیا تھی۔ انہوں نے مغربی فلاسفہ اور ہم عصر سیاسی نقادوں کو سمجھا اور سنا ہے اور پھر قرآنی فلسفہ کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے۔ جو اسلامی نظام سیاست کی مکمل کتاب ہے۔ تقابلی مطالعہ نے ان میں یہ اہلیت پیدا کر دی ہے کہ وہ اسلامی نظام کو ہر نظام حیات سے افضل سمجھنے لگے اور کچھ سمجھانے سے پہلے وہ اس منزل سے گذرے جہاں خیالات کا طوفان قلب کو تڑپ بخشتا ہے۔ چشم بینا ہو جاتی ہے اور عقل دانا کہلاتی ہے۔ نظریوں میں جب تشکیک باقی نہیں رہتی تو یقین کامل کا یہ انداز پیدا ہو جاتا ہے۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زرِ کم عیار ہو گا!
تمہاری تہذیب خود اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا نہ پائیدار ہو گا

موجودہ دور میں سیاست کے تین اہم ضابطے ہیں جن پر آج دنیا تقسیم ہے۔ قومیت، جمہوریت اور اشتراکیت، ملوکیت اپنی اصلی شکل و روح میں آج چونکہ نہیں اس لیے اس کا ذکر کرنا بیکار ہے۔ ان تینوں ضابطوں میں سے اشتراکیت ایک ایسا ضابطہ ہے جو کہیں کہیں اسلام کے اصولوں سے مماثلت رکھتے ہوئے بھی اسلام کی ضد ہے۔

جس طرح ملوکیت کا ردِ عمل قومیت ہے اسی طرح سرمایہ داری کا اشتراکیت ستر ویں اور اٹھارویں صدی میں ہوبز، لاک، روسو اور والیٹر نے معاہدہ عمرانی یعنی SOCIAL CONTRACT کو ریاست کی بنیاد قرار دیا تھا۔ اس کے نتیجے میں فرانس میں انقلاب رونما ہوا جس نے پورے یورپ پر اثر ڈالا۔ اور یہی وہ ابتدا ہے جہاں سے سوشلزم کی بنیاد بھی پڑی۔ اسی سوشلزم کو روس میں اشتراکیت کی شکل دی گئی۔ معاہدہ عمرانی کے بنیادی نکات وضع کرنے والے فلاسفہ قرآن کے خوشہ چین ہیں۔ انسانی برادری اور مساوات کچھ ان کی اختراع نہیں۔ اس کے بڑے بڑے مظاہر سے تاریخ اسلام بھری پڑی ہے۔ اگر اشتراکیت سرمایہ داری کے خلاف ہے تو اسلام اور اس کا مبلغ اقبال بھی سرمایہ داری سے متنفر ہے۔ اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں سے زکوٰۃ ایک ایسا رکن ہے جس پر عمل پیرا ہو کر خود بخود سرمایہ داری کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اگر ایک طرف ایک معتبرہ حیثیت رکھنے والے پر حکم لگایا ہے کہ اپنے نقد سونا چاندی اور زمین، اور جائداد پر خاص تناسب سے اللہ کا حق ہے۔ تو دوسری جانب یہ ٹیکس ایسے افراد پر واجب الادا ہے۔ جو انتہائی غریب ہیں۔ اس طرح دولت کی منصفانہ تقسیم ہوتی ہے۔ اور ارتکازِ دولت کا بھی سدِ باب ہوتا ہے۔ اسلام کنجوسی کا بھی مخالف ہے اس میں بھی ارتکازِ دولت کی نفی کا واضح فلسفہ موجود ہے۔ اور دوسری جانب اس کے بے دردی سے خرچ کرنے کی ممانعت ہے۔ جو خود کو زکوٰۃ کا مستحق بنا دے۔ اسلام کے یہ عالمگیر معاشی احکامات سرمایہ داری کی نفی بھی تو کرتے ہیں۔ پھر بھی یہ اشتراکیت نہیں۔ اکثر لوگ اقبال کو اشتراکیت کا حامی سمجھتے ہیں۔ اگر اقبال سرمایہ نظام کو غلط سمجھتے ہیں تو انہیں اشتراکی کیوں اسلامی مبلغ کیوں نہ کہیں۔ اشتراکیت کا بنیادی نعرہ نفی سرمایہ داری، نفی عبادت، اور نفی توحید پر مشتمل ہے اول الذکر کا حامی اسلام بھی ہے اقبال بھی۔ کلیسا اور توحید کا منکر نہ اسلام ہے نہ اقبال۔ اسلام دل و روح اور عمل میں آزادی دیتا ہے۔ اشتراکیت عمل کی قوت کو سلب کر لیتی ہے۔ اسلام میں اخلاق و کردار ضروری ہے۔ اشتراکیت کی بنیاد لا، ہے اشتراکیت خدا سے منکر ہے اور وحدہٗ لاشریک پر ایمان لانا اسلام کا اولین سبق ہے۔ اشتراکیت محض اور محض دنیا ہے۔ اور اسلام دین و دنیا دونوں۔!

اقبال نے اشتراکیت کی قباحتیں ذہن نشین کرانے کے لئے ارمغان حجاز میں ابلیس کی مجلس شوریٰ میں ابلیس اور اس کے مشیروں کا پیچ و تاب جس انداز پر دکھایا ہے وہ صرف ان کا ہی حصہ تھا۔ اقبال کی یہ شہکار نظم بصیرت، علم، اور بلاغت میں بے مثال ہے۔ اقبال ہر خوبی کی تعریف کرتے ہیں مگر جہاں مذہب سے ٹکراؤ ہوتا ہو۔ وہاں سے وہ راستہ بدل لیتے ہیں۔ مذہب کو وہ کسی نظریہ یا کسی اور مفاد پر قربان نہیں کر سکتے۔ کارل مارکس اور اسکی کتاب کے لیے وہ یوں رقم طراز ہیں

وہ کلیم بے تجلی وہ مسیح بے صلیب
نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب
کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہِ پردہ سوز
مشرق و مغرب کی قوموں کے لئے روزِ حساب
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و نظر کا انقلاب
توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب

مذکورہ نظم میں اقبال نے سرمایہ داری کو ابلیسی نظام قرار دیا ہے ابلیس اپنے کارناموں پر مطمئن ہے مگر ساتھ ہی ساتھ ایک کھٹک بھی ہے اسے ایک خاص نظام کی طرف سے!!

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے!
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

ابلیس کو اس نظام کی طرف سے خطرہ ہے جو

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امین
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و نظر کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمین

آخر میں وہ صاف صاف اس نظامِ حیات کا نام لے لیتا ہے جس سے اسے خطرہ ہے

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے

اس سے بڑھ کر انسانی برادری کی مثال اشتراکیت کہاں پیش کر سکتی ہے کہ زمین اللہ کی ملکیت ہے اور تم ایک امیں ہو خلق کے سامنے اس کے لیے جواب دہ ہو، اس کے علاوہ تقسیم دولت کے لئے زکوٰۃ کا فلسفہ اور خیرات کا حکم اور حاجت سے زائد مال غریبوں محتاجوں یتیموں، مسکینوں، قرابت داروں، دوستوں اور ہمسائیوں کی ضرورت پر خرچ کرنے کی توفیق پیدا ہو جائے تو کسی سوسائٹی کے خوش حال ہونے میں کیا شک رہ جاتا ہے۔ ابلیس کے اندیشے بجا ہیں مگر اس کا حل بھی ابلیسی دماغ نے سوچ رکھا ہے وہ یہ کہ اسلام کے نام لیواؤں کی توجہ ان اعمال و اخلاق کے ارفع و اعلیٰ اصولوں سے ہٹا دی جائے جس سے تخریبی عناصر پر زد پڑتی ہو اور انہیں ان ذیلی باتوں میں الجھا دیا جائے جن کا حیات میں کوئی خاص مقام نہ ہو اور اذہان کو یوں تربیت دی جائے کہ وہ ذیلی مسائل کو بنیادی سمجھنے لگیں اور بنیادی مسائل کو بھلا دیں۔ اقبال کے الفاظ میں ابلیس کی یہ گہری سازش یوں ہے

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے
ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عین ذات
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے
یا مجدد، جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم
امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات
کیا مسلماں کے لئے کافی نہیں اس دور میں
یہ الہیات کے ترشے ہوئے لات و منات
تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

اشتراکیت کے معاشی نظام میں ایک اصول دولت کی مساویانہ تقسیم ہے۔ یہ سخت ناممکن ہے۔ کسی کی سخت کوشش اور محنت زیادہ معاوضہ کی حقدار ہوتی ہے اور کسی کی کم۔ اس طرح ناانصافی ہوگی اس کے ساتھ جو محنتی ہوگا اور کاہلی کی پرورش ہوگی اسکی جسکو بغیر قوت بازو آنہ پائی بھی اتنا مل جائے۔ اس طرح زندگی سے تڑپ اور چمک ختم ہو جاتی ہے۔ اور لہو گرم رکھنے کا کوئی بہانہ ہاتھ نہیں آتا۔ حرکت ختم ہو جائے تو اجسام جامد کہلاتے ہیں اور پھر بڑے پیمانے پر قوم پر جمود طاری ہو سکتا ہے۔ اسلام میں زکوٰۃ خیرات صدقہ اور امداد جیسے معاشی اصول موجود ہیں تو دولت کی مساویانہ نہ سہی منصفانہ تقسیم ضرور ہو سکتی ہے۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں مکہ مدینے اور مفتوحہ بہت سے شہروں میں بڑے بڑے تجار اور دولتمند لوگ موجود تھے ان سے دولت چھین لینے کی ضرورت کبھی نہ پڑی کیونکہ وہ اپنی دولت کے استعمالات سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ دولت کی زیادتی بڑا آدمی نہیں بناتی بلکہ بڑے اور چھوٹے کا پیمانہ تقویٰ ہے۔ دولت قاضی الحاجات ضرور ہے مگر حیثیت و اہمیت اس کی اتنی نہیں۔ جب مومن کا اعتبار اس پیمانہ سے اٹھ گیا تو اس سے فائدہ اٹھا کر یہ رسوائے زمانہ نظام اشتراکیت کا رائج ہوا جس کی ہیبت آج ساری دنیا کے لیے خطرہ ہے۔ پابندیاں انسان کی فطرت نہیں۔ پھر۔

زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر
وہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لبِ گور

معاشیات کے علاوہ اشتراکیت میں چند اخلاقی پہلو بھی قابل مذمت ہیں ان میں سب سے بڑھ کر قابل نفرت شق ہے تشدد۔ لینن اپنے دوست گارسکی کو سکھلاتا ہے۔ "ہم ایک آہنی عہد میں رہتے ہیں ہمارا کام رحم نہیں بلکہ سروں کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے ان میں سے گودا نکال لینا ہے" غور فرمایئے ان بہیمانہ الفاظ پر گویا یہ انسانوں کا نہیں بلکہ کسی غیر مرئی شے کا ذکر ہے۔ نہ صرف یہ کہا گیا بلکہ کیا بھی گیا۔ لینن نے اشتراکیت کے لئے ۱۹۲۴ء میں تقریباً ستر لاکھ انسانوں کا خون روس میں بہا دیا ان میں دو لاکھ مزدور اور نو لاکھ کسان بھی شامل تھے یہ وہ طبقہ ہے جسکے نام پر اشتراکی مساوات کا مضحکہ خیز دعویٰ کرتے ہیں۔ (اعداد شمار ڈیلی گزٹ کراچی جون ۱۹۲۴ء) اس بربریت کی اجازت اگر اشتراکیت دے تو دے اسلام اسکی اجازت نہیں دے سکتا۔ احترام انسانیت اسلام کی عظیم الشان تعلیم ہے۔ قول و فعل کا یہ تضاد اشتراکیت ہی پیش کر سکتی ہے۔

جلالی صفتوں میں اگر اعتدال نہ برتا جائے تو نتیجہ تباہی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اللہ کے وہ نشتر جن کو تیمور یا چنگیز کہا جائے ہٹلر یا مسولینی وغیرہ کا نام دیا جائے یا لینن کے نام سے یاد کیا جائے اپنی جگہ بڑی قوت و شوکت رکھتے تھے جلالی پہلو کی عمدہ مثال تھے لیکن انکی وجہ سے کتنی ہی تہذیبیں اور تمدن برباد ہوئے۔ انسان اور دنیا کا امن خطرے میں پڑا یہ ہر گز قوت و شوکت کا جائز استعمال نہ تھا۔ اگر جلالی قوتوں سے حق کی حفاظت کا کام لیا جائے اور دین و مذہب کی جمالی گرفت ان پر مضبوط ہو تو علیٰ پیدا ہوتا ہے۔ اقبال نے ضربِ کلیم میں اس کو یوں لکھا ہے۔

تاریخ امم کا یہ پیغام ازلی ہے
صاحب نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک
لادیں ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاق

ملوکیت کی خواہ کوئی بھی تعریف ہو اشتراکیت کا ایک پردہ ہی نظر آتی ہے اس نظام میں ایک جماعت سارے نظام کو چلاتی ہے روٹی کپڑے کی لالچ دے کر انسان کی آزادی سلب کر لینا ایسی بربریت ہے جس کا حساب نہیں۔ انسان کی زندگی حیوانی بن جاتی ہے حیوان جو دیکھتا ہے بول نہیں سکتا رائے نہیں دے سکتا۔ اقبال زندگی میں حرکی تصور کے قائل ہیں اسی لئے جو مزا ان کے شاہین کو کبوتر پر جھپٹنے میں آتا ہے وہ اس کے لہو میں نہیں زندگی میں حرکت خون گرم رکھتی ہے اور ہر آنے والی افتاد کے مقابلے کے لئے تیار کرتی ہے۔ حرکت اور بہیمیت میں فرق ہے۔ جبر و قہر سے جہانبانی ممکن نہیں۔ فرد کی اہمیت جہاں خس و خاشاک کی ہو وہاں قوم کی عمارت کی پائیداری کا کیا سوال۔ ڈکٹیٹر شپ ملوکیت ہی کا ایک انداز ہے۔ اس کے بظاہر خوبصورت قوانین سادہ لوح عوام کو دھوکہ دینے اور اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے وضع کیے جاتے ہیں۔

گرچہ ہے دلکش بہت حسنِ فرنگ کی بہار
طائرک بلند بام دانہ و دام سے گزر!

شخصی حکومت کا اسلام ہمیشہ دشمن رہا ہے تاریخ شاہد ہے کہ جہاں عوام کی رائے شامل نہ رہی شخصی رائے ہمیشہ ناکام رہی۔

خدا آں ملتِ را سروری داد
کہ تقدیرش بدست خویش بنوشت
بہ آں ملت سروکارے ندارد
کہ دہقانش برائے دیگرے کشت!

کارل مارکس نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ صنعتکاروں کا طبقہ اشتراکیت رائج کرنے میں بڑا معاون ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے مگر جب دیدہ بینا بنام ہمدردی ذاتی اغراض کو پا جاتی ہے تو یہی طبقہ اشتراکیت کی تبلیغ کرنے والوں کا گورکن بن جاتا ہے۔ اقبال اسی طبقے سے مخاطب ہیں۔

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریق کوہ کن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

اشتراکیت کا سب سے قابل نفرت پہلو مذہب سے بیگانگی ہے جب اپنے قول و عمل کے نتیجہ میں کسی برتر ہستی سے انعام یا سزا کی توقع نہ ہو اطمینان و خوف نہ ہو اور اپنے آپ کو کسی کے سامنے جواب دہ ہونے کا ڈر نہ ہو، اخلاقیات کا تصور کہاں باقی رہ سکتا ہے۔ ضمیر پاک اور خیالات بلند ایک قصہ پارینہ بن جاتے ہیں۔ کسی فرد قوم یا جماعت کا اعلیٰ ترین سرمایہ اس کا اخلاق ہوتا ہے جب اس کا کوئی تصور ہی باقی نہ رہ جائے تو ایسی جماعتوں کی عمر طویل نہیں ہوتی۔ اشتراکیت کے ضابطوں میں چند ایک جو کہیں کہیں اسلام سے تھوڑی بہت موافقت رکھتے تھے ان کی بدیہی کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اقبال مثنوی پس چہ باید کرد میں لکھتے ہیں۔

روس را قلب و جگر گردیدہ خوں | از ضمیرش حرف لا آمد بروں
لا و الا ساز برگِ امتاں | نفی بے اثبات مرگِ امتاں

دل کا سکون اور اطمینان کسی نہ کسی عقیدے میں پنہاں ہے۔ ہر چیز کی نفی کر دینا تو آسان ہے مگر اطمینانِ قلب اس طرح مفقود ہو جاتا ہے۔ سزا اور جزا کی توقع نہ ہو تو اخلاقیات پر زد پڑتی ہے اور اخلاق فرد، قوم اور جماعت کا اعلیٰ ترین سرمایہ ہوتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو محض مذہب سے بیگانگی زندگی کے ہر شعبہ میں توڑ پھوڑ کا سبب ہوتی ہے اور یہ سلسلہ دراز ہوتا جاتا ہے۔ اشتراکیت کا یہی ضابطہ اپنی تخریب کے سبب اقبال سے کہلواتا ہے۔

مری نگاہ میں ہے یہ سیاستِ لادیں کنیزِ اہرمن و دوں نہاد و مردہ ضمیر

علامہ اقبال کی شخصیت اور فن پر لکھی جانے والی پہلی کتاب

اقبالؒ

مصنفہ : احمد دین (مصنف "سرگزشت الفاظ")

مرتبہ : مشفق خواجہ

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۲۳ء میں طبع ہوئی تھی اور اس ایڈیشن کے تمام نسخے جلا دیے گئے تھے۔ دوسری مرتبہ یہ کتاب ۱۹۲۶ء میں ترمیموں اور اضافوں کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ نئے ایڈیشن میں متن ۱۹۲۶ء کے ایڈیشن پر مبنی ہے اور ۱۹۲۳ء کے ایڈیشن کے تمام حذف شدہ مباحث اور اختلافات کو کتاب کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے۔

کتاب کے شروع میں مرتب نے طویل مقدمہ لکھا ہے جس میں احمد دین کے حالاتِ زندگی، ادبی کاموں اور علامہ اقبال سے ان کے تعلقات کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔

صفحات : ۵۲۸ قیمت : چالیس روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ۔ کراچی نمبر ۱

نئے خزانے

ابوسلمان شاہجہاں پوری

یہ اشاریہ مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے۔

اردو زبان اور اس کے مسائل
ادب و تنقید
تحقیق و تنقید
تاریخ و سیاست
تعلیم
سیر و سیاحت
شخصیات
ابوالکلام آزاد
علامہ اقبال
محمد علی جوہر
ماہر القادری
صحابہ کرام رض
علماء و مشائخ
ادبی شخصیات
کتابیات
مذہبیات

اس اشاریے کی ترتیب میں ماہ جنوری ۱۹۷۹ء اور دیگر مہینوں کے مندرجہ ذیل رسائل سے مدد لی گئی ہے۔

ماہنامہ	الرشید	ساہیوال	جنوری ۱۹۷۹ء	پندرہ روزہ	صحیفہ اہلِ حدیث	〃	جنوری ۱۹۷۸ء
سہ ماہی	الزبیر	بہاول پور	نمبر ۲ ۱۹۷۸ء	〃	الاحرا	لاہور	۱۶ر دسمبر ۱۹۷۸ء
سالنامہ	الغزالی	حیدرآباد	۷۸-۱۹۷۷ء	ہفت روزہ	الاسلام	〃	جنوری ۱۹۷۹ء
		(غزالی گورنمنٹ کالج حیدرآباد سندھ)		〃	الاعتصام	〃	〃 〃
ماہنامہ	المعارف	لاہور	جنوری ۱۹۷۸ء	〃	المنبر	فیصل آباد	۲۴ر جنوری 〃
〃	آسمان	کراچی	دسمبر ۷۸ء و جنوری ۱۹۷۹ء	〃	الہام	بہاول پور	۷ر۱۴ 〃
〃	برہان	دہلی	دسمبر ۷۸ء 〃 〃	〃	انصاف	راولپنڈی	۳ر۹ 〃
〃	پیامِ عمل	لاہور	جنوری ۱۹۷۹ء	〃	ایشیا	لاہور	دسمبر 〃
〃	ترجمان الحدیث	〃	〃	〃	تعمیرِ حیات	لکھنؤ	۲۵ر دسمبر و ۱۶ر جنوری
〃	ترجمان القرآن	〃	〃				۱۹۷۸ء
〃	سوداگر	کراچی	〃	〃	چٹان	لاہور	〃 〃 〃
〃	طلوعِ اسلام	لاہور	〃	〃	خدام الدین	〃	〃 〃 〃
〃	فاران	کراچی	دسمبر ۱۹۷۸ء	〃	کشمیر	مظفرآباد	یکم ۹ر 〃
		(ماہر القادری نمبر)		〃	لاہور	لاہور	۷ر۱۴ 〃
〃	قومی زبان	کراچی	دسمبر و جنوری ۱۹۷۸ء	〃	ہماری زبان	دہلی	۲۲ر اکتوبر ۷۸ء تا
		(بیادِ مولانا محمد علی جوہر)					۸ر جنوری ۱۹۷۹ء

اُردو زبان اور اس کے مسائل

انوار الحق، شیخ	خطبہ صدارت اردو تعلیمی دفتری کانفرنس لاہور	قومی زبان	کراچی	جنوری ۱۹۷۹ء	ص ۵
آفتاب حسن، ڈاکٹر	قومی تعلیمی پالیسی میں اردو کا مقام	چٹان	لاہور	یکم 〃 〃	ص ۱۱
خسروی	اردو	الزبیر	بہاول پور	نمبر۲ ۱۹۷۸ء	ص ۵۸
ذکی الدین پال	خطبہ صدارت اردو تعلیمی عدالتی زبان کانفرنس لاہور	قومی زبان	کراچی	جنوری ۱۹۷۹ء	ص ۱۲
عبداللہ، ڈاکٹر سید	مقاصد نامہ اردو تعلیمی، دفتری عدالتی زبان کانفرنس لاہور	قومی زبان	کراچی	جنوری ۱۹۷۹ء	ص ۸
محمد صفدر، خواجہ	خطبہ صدارت اردو تعلیمی، دفتری عدالتی زبان کانفرنس لاہور	قومی زبان	کراچی	〃 〃	ص ۲۰
مرتضیٰ جعفری، ڈاکٹر سید	قومی زبان اور ہم	〃	〃	〃 〃	ص ۱۶

ادب و تنقید

جمیل واسطی، پروفیسر	شاعری کی حقیقت	الزبیر	بہاولپور	نمبر۲ ۱۹۷۸ء	ص ۸۶
دلشاد کلانچوی، پروفیسر	بیکن نے لکھ دیئے ہوں ڈرامے، نہ مانیے	〃	〃	〃 〃	ص ۳۰
دور آفریدی	اردو خطوط نگاری کی اساس	ہماری زبان	دہلی	۲۳ر دسمبر 〃	ص ۲
رحمت فرخ آبادی، پروفیسر	اردو میں ادبی معرکے کا آغاز	الزبیر	بہاول پور	نمبر۲ 〃	ص ۶
〃	نذیر احمد کے ادبی معرکے	〃	〃	〃 〃	ص ۱۶
سمیع اللہ	منظوم ترجمہ اور سہیل اختر	〃	〃	〃 〃	ص ۶۶
اللہ دتہ چوہدری، ڈاکٹر	فارسی پر عربی کی چھاپ	〃	〃	〃 〃	ص ۴۴
عائشہ بیگم	اردو غزل اور حالی	ہماری زبان	دہلی	۸ر دسمبر 〃	ص ۱۲
نرجس فاطمہ، سیدہ	شکنتلا اور شیکسپیر میں ہیروئنس	〃	〃	۸ر جنوری ۱۹۷۹ء	ص ۱۲
ہاشم رضا، سید	ادبی معرکے	الزبیر	بہاول پور	نمبر۲ ۱۹۷۸ء	ص ۲۳

لسانیات

صابر سنبھلی	اردو میں مستعمل چند الفاظ	ہماری زبان	دہلی	یکم جنوری ۱۹۷۹ء	ص ۱۲
منظور الحق صدیقی، پروفیسر پیرزادہ	انگریزی میں "قائد اعظم" کس طرح لکھا جائے۔	قومی زبان	کراچی	جنوری "	ص ۲۲
واصف، مولوی حفیظ الرحمن	اردو املا۔ ایک تنقیدی نظر	برہان	دہلی	دسمبر ۱۹۷۸ء	ص ۳۶۵
"	" " " جائزہ	"	"	جنوری ۱۹۷۹ء	ص ۵۷

تحقیق و تنقید

درشہوار ابراہیم	شام شہر یاراں۔ ایک تجزیہ	قومی زبان	کراچی	جنوری ۱۹۷۹ء	ص ۲۷
عبدالعزیز، پروفیسر میاں	مسلمان سیاحوں کے سفرنامے	الزبیر	بہاولپور	نمبر۲ ۱۹۷۸ء	ص ۷۹
محمد خالد عابدی	چمنستان خلیل	ہماری زبان	دہلی	دسمبر ۱۹۷۸ء	ص ۱۲

تاریخ و سیاست

ابن عبداللطیف	جنوبی فلپائن کے مسلمان	تعمیر حیات	لکھنو	۲۵ جنوری ۱۹۷۹ء	ص ۸
ابوالحسن علی ندوی، مولانا	خطبہ صدارت اجلاس آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت دہلی دسمبر ۱۹۷۸ء	"	"	۱۰ " "	ص ۶
ابوسلمان شاہجہاں پوری	قائد اعظم اور ہوم رول لیگ	چٹان	لاہور	۲۲ " "	ص ۱۹
"	" " " " (۲)	"	"	۲۹ " "	ص ۲۳
احسن مفتاحی	مغربی بنگال میں اردو لسانی اقلیت کے مسائل کی پیشی	ہماری زبان	دہلی	۸ دسمبر "	ص ۷
اسحق جلیس ندوی	ملکی مسائل اور سردار تحریک	تعمیر حیات	لکھنو	۱۰ جنوری "	ص ۳
اکبر شاہ جام پوری، سید محمد	کیا اسلامی تعزیرات وحشیانہ ہیں	الرشید	ساہیوال	دسمبر ۱۹۷۸ء	ص ۲۷
آفتاب اختر	میکاولی کا نظریۂ سیاست	لاہور	لاہور	۱۷ جنوری "	ص ۱۲

بدیع الدین، مولانا شاہ	اسلامی نظام کے ثمرات	صحیفہ اہل حدیث	کراچی	۱۶؍جنوری ۱۹۷۹ء ص
برق توحیدی، مولانا	تحریک وہابیت کا اصل حریف ـ سکھ یا انگریز	ترجمان الحدیث	لاہور	- " " ص
رازق الخیری	دلی کے پنجابی	سوداگر	کراچی	- " " " ص ۱۵
رام لال	ہندوستان میں اظہار کی آزادی	ہماری زبان	دہلی	۸؍دسمبر ۱۹۷۸ء ص ۱
سلیمان ندوی، مولانا سید	اسلامی حکومت کا مقصد	ایشیا	لاہور	۱۰؍ " " ص ۱۰
طاہر حسن نقوی، پروفیسر سید	معرکہ کربلا کے اسلام پر اثرات	پیام عمل	"	جنوری ۱۹۷۹ء ص ۲۳
عابد کمالوی	محمد زمان اچکزئی سے ایک انٹرویو	چٹان	"	۱۵؍ " " ص ۱۵
عامر حسین	شاہ فرید الحق سے انٹرویو	"	"	" " ص ۲۲
عبدالرشید عراقی، ملک	امت مسلمہ میں فرقہ بندی کی تاریخ	الاسلام	"	۱۲؍ " " ص ۵
"	" " "	"	"	۵؍ " " ص ۷
غلام احمد بدوی، پروفیسر	شکارپور ـ تاریخی جائزہ	قومی زبان	کراچی	جنوری " ص ۲۷
محمد ایوب خاں	پونچھ شہر کا محاصرہ	کشمیر	مظفرآباد	یکم " " ص ۵
محمد جعفر، مولانا سید	حسینؑ کے بعد زینبؓ پر کیا گزری	پیام عمل	لاہور	جنوری " ص ۱۱
محمد طیب، قاری	شاہ اسمٰعیل شہید کے مزار پر	الرشید	ساہیوال	دسمبر " ص ۱۴
محمد ہاشم، ایس	مسجد قرطبہ	برہان	دہلی	جنوری " ص ۲۹
نجم الدین احمد	ایران میں روس کی دلچسپی	ایشیا	لاہور	۲۷؍نومبر ۱۹۷۸ء ص [illegible]
"	عربوں کی زمین پر یہودی بستیاں	"	"	۳؍دسمبر " ص ۶
"	آریہ مہر کو جانا پڑے گا	"	"	۱۰؍ " " ص ۱۶
نصر، حکیم عبداللہ خاں	حروب صلیبیہ کا پس منظر (۲)	الاعتصام	"	۵جنوری ۱۹۷۹ء ص ۷
وقار انبالوی	تحریک پاکستان کے خدوخال	کشمیر	مظفرآباد	۹؍ " " ص ۳

تعلیم

ابوالحسن علی ندوی، مولانا	رپورٹ دارالعلوم ندوۃ العلما	تعمیر حیات	لکھنو	۱۰؍جنوری ۱۹۷۹ء ص ۷
حسن، پروفیسر سید	تعلیم بالغان کا مسئلہ	ہماری زبان	دہلی	۲۲؍اکتوبر " ص ۷
حیات اللہ انصاری	کیا کسی کو پھر کسی کا امتحان	"	"	" ۱۹۷۸ء ص ۱

سلطانہ حیات	دس دن میں اردو کیوں کر	ہماری زبان	دہلی	۲۲ر اکتوبر ۱۹۷۸ء ص ۱۲
″ ″	حکومت سے تعلیم بالغان کے لیے مالی امداد	″	″	″ ″ ″ ص ۱۷
عبداللہ، ڈاکٹر سید	نئی تعلیمی ترمیم پر ڈاکٹر سید عبداللہ کا بیان	خدام الدین	لاہور	۱۲ر جنوری ۱۹۷۹ء ص ۲۲
عبدالمغنی، پروفیسر	تعلیم بالغان کی اردو مہم اور اردو آبادی	ہماری زبان	دہلی	۲۲ر اکتوبر ۱۹۷۸ء ص ۲۰
نعیم صدیقی	تعلیم کا تہذیبی نظریہ اور مہم	ترجمان القرآن	لاہور	جنوری ۱۹۷۹ء ص ۳۰
″ ″	ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے (پرائمری ٹیچر)	ہماری زبان	دہلی	۲۲ر اکتوبر ۱۹۷۸ء ص ۵

سیر و سیاحت

اسحق جلیس ندوی	دس دن ۔ پانچ دریاؤں کی سرزمین میں (۵)	تعمیر حیات	لکھنو	۱۰ر جنوری ۱۹۷۹ء ص ۱۵
″ ″ ″	″ ″ ″ ″ ″ (۶)	″	″	۱۷ر ″ ″ ص ″
″ ″ ″	″ ″ ″ ″ ″ ″	″	″	۲۵ر ″ ″ ص ۱۷

شخصیات

ابوالکلام آزاد

ابوسلمان شاہجہاں پوری	مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے علما حق کے خلاف سازشوں کا پس منظر	اذان	ملتان	یکم دسمبر ۱۹۷۸ء ص ۵
″ ″ ″	مولانا عبیداللہ سندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد	چٹان	لاہور	۸ر جنوری ۱۹۷۹ء ص ۲۱
″ ″ ″	″ ″ ″ ″ (۲)	″	″	۱۵ر ″ ″ ص ″
عبدالرشید، ڈاکٹر کرنل خواجہ	امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد	″	″	۱۸ر دسمبر ۱۹۷۸ء ص ۱۷

فرید احمد	مولانا ابوالکلام آزاد	چٹان	لاہور	یکم جنوری ۱۹۷۹ء ص ۲۱

علامہ اقبالؒ

احمد شمیم خاں، پروفیسر	اقبال اور اردو	الغزالی	حیدرآباد	۷۸-۱۹۷۷ء ص ۳۱
اختر الحسن، محمد	اقبال اور شہنشاہیت	ہماری زبان	دہلی	۲۲، دسمبر ۱۹۷۸ء ص ۱
رضا، کالی داس گپتا	غالب اور اقبال مشرقی افریقہ میں	" "	"	یکم جنوری ۱۹۷۹ء ص ۱
بدر ہاشمی، پروفیسر	زندہ حقیقتوں کا شاعر	الغزالی	حیدرآباد	۷۸-۱۹۷۷ء ص ۲۷
سعید درگاہی	مرید ہندی	تعمیر حیات	لکھنؤ	جنوری ۱۹۷۹ء ص ۸
صلاح الدین صدیقی، پروفیسر	اقبال اور عشق رسولؐ	الغزالی	حیدرآباد	۷۸-۱۹۷۷ء ص ۲۹
عبدالرشید، کرنل خواجہ	علامہ اقبال کا نفسیاتی تجزیہ	چٹان	لاہور	۸، جنوری ۱۹۷۹ء ص ۲۴
"	" " "	"	"	۲۲، " " ص ۱۴
"	" " " "	"	"	۲۹، " " ص ۲۷
عبدالسلام خاں	اقبال اور ابن عربی	برہان	دہلی	دسمبر ۱۹۷۸ء ص ۳۲۷
عبدالوہاب خاں، پروفیسر	علامہ اقبال ایک معلم کی حیثیت سے	الغزالی	حیدرآباد	۷۸-۱۹۷۷ء ص ۸۴
غلام مرتضیٰ قریشی	بہ سلسلہ "علامہ اقبال کا نفسیاتی مطالعہ"	چٹان	لاہور	یکم جنوری ۱۹۷۹ء ص ۳۷
منیر علی جعفری، ایس ایم	رومی اور اقبال کا تصور عشق	ہماری زبان	دہلی	۸، " " ص ۱
وقار احمد رضوی	فکر اقبال کے چند پہلو	برہان	"	دسمبر ۱۹۷۸ء ص ۳۵۱

محمد علی جوہر

اسحٰق جلیس ندوی	مرے جوہر آپ کے جوہر کھلے	تعمیر حیات	لکھنؤ	۲۵، دسمبر ۱۹۷۸ء ص ۳
افسر صدیقی	مولانا محمد علی کی ننھیال	قومی زبان	کراچی	دسمبر " ص ۷
انجم، قاضی عارف حسین	علی برادران کا خاندان، وطن اور شجرہ نسب	" "	"	جنوری ۱۹۷۹ء ص ۲۳
جہانگیر عالم، محمد	مولانا محمد علی جوہر۔ ایک سیاسی مطالعہ	" "	"	دسمبر ۱۹۷۸ء ص ۴۶
رئیس منظر	محمد علی کا مولد و وطن۔ رام پور	ہماری زبان	دہلی	۸، جنوری ۱۹۷۹ء ص ۳

شاہین، رحیم بخش	کلام جوہر	قومی زبان	کراچی	دسمبر ۱۹۷۸ء	ص ۲۳
شبیر علی کاظمی، سید	اداریہ قومی زبان محمد علی نمبر	〃	〃	〃	ص ۳
شہاب دہلوی	رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر	الہام	بہاول پور	۷، جنوری ۱۹۷۹ء	ص ۱
صابر آفاقی، ڈاکٹر	مولانا محمد علی جوہر کی شاعری	قومی زبان	کراچی	دسمبر ۱۹۷۸ء	ص ۲۷
〃	〃 〃 〃 〃 لہ	لاہور	لاہور	۷، جنوری ۱۹۷۹ء	ص ۱۲
عبدالحق، ڈاکٹر مولوی	مولانا محمد علی جوہر	قومی زبان	کراچی	دسمبر ۱۹۷۸ء	ص ۵
عتیق احمد صدیقی	حیات محمد علی پر ایک نظر	ہماری زبان	دہلی	یکم 〃	ص ۳
کوثر، ڈاکٹر انعام الحق	اللہ کا بانکا	قومی زبان	کراچی	- 〃 〃	ص ۱۸
مینا، امینہ بانو	مولانا محمد علی جوہر کی شاعری	آسمان	〃	جنوری ۱۹۷۹ء	ص ۵

ماہر القادری

اقبال احمد صدیقی	داماں نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار	فاران	کراچی	دسمبر ۱۹۷۸ء	ص ۱٦
صلاح الدین، محمد	ماہر ترے مرنے کی ادا یاد رہے گی	〃	〃	〃 〃	ص ۲۵
اسعد گیلانی، سید	بھرپور زندگی ـ قابلِ رشک موت	〃	〃	〃 〃	ص ۲۳
حمید اللہ، ڈاکٹر محمد	کلام اللہ، حکمت و دانش کے چند نئے پہلو	〃	〃	〃 〃	ص ۲۸
مہدی علی صدیقی	کوئی جہاں میں تیری مثال لا نہ سکا	〃	〃	〃 〃	ص ۴۷
تابش دہلوی	عالم دین، ادیب، شاعر، بذلہ سنج اور محقق	〃	〃	〃 〃	ص ۷۷
ماہر القادری	خود نوشت	〃	〃	〃 〃	ص ۵۲
〃	میری کہانی میری زبانی	〃	〃	〃 〃	ص ۱۷۱
وحیدہ نسیم	کیا مولانا ماہر خفا ہو گئے	〃	〃	〃 〃	ص ۱۷۵
شفیق بریلوی	ماہر القادری زندہ جاوید	〃	〃	〃 〃	ص ۱۵۲
مشتاق احمد، نواب	میرا دوست ماہر القادری	〃	〃	〃 〃	ص ۱۵۷
لالہ صحرائی	باشندہ حجاز	〃	〃	〃 〃	ص ۱٦۱
وفا راشدی	ماہر القادری ـ ایک نیک صفت انسان	〃	〃	〃 〃	ص ۱۷٦

لہ قومی زبان کراچی سے منقول۔

محمد ریاض، ڈاکٹر	حرفے چند۔ بیاد حضرت ماہرؒ	فاران	کراچی	دسمبر ۱۹۷۸ء	ص ۱۹۱
اسمٰعیل احمد ضیائی	اے ہم نقسان محفل ما (ماہر القادری)	"	"	" "	ص ۱۹۷
شاہین، رحیم بخش	اردو زبان پر تحقیق اور اصلاح اور ماہر القادری	"	"	" "	ص ۲۷۰
منظور نعمانی، مولانا محمد	اسلامی شاعر و ادیب	"	"	" "	ص ۲۷۵
حبیب احمد صدیقی	مولانا ماہر القادری کی دینی معلومات	"	"	" "	ص ۲۷۷
عبدالقدوس ہاشمی، مولانا سید	ایک عزیز مخلص دوست	"	"	" "	ص ۲۵۸
شاکر عروجی	یاد رفتگان کی مشعل جلانے والا	"	"	" "	ص ۲۶۸
صباح الدین عبدالرحمن، سید	ماہر القادری۔ ایک باغ و بہار شخصیت	"	"	" "	ص ۲۷۵
رئیس امروہوی	ہمہ داں زندہ دل اور بے ریا ماہر القادری	"	"	" "	ص ۲۹۸
گوہر ملسیانی	ماہر القادری ایک ممتاز نعت گو	"	"	" "	ص ۳۰۷
غلام جیلانی، چودھری	اب جلد میرے بھائی کو واپس بلائیے	"	"	" "	ص ۳۱۹
محمد ایوب قادری	پاکستان میں تحریک اسلامی ادب کے بانی	"	"	" "	ص ۳۲۵
طالب ہاشمی	مولانا ماہر القادری کا عشق رسول	"	"	" "	ص ۳۳۱
وارث سرہندی	ماہر القادری مرحوم	"	"	" "	ص ۳۳۹
آفتاب احمد نقوی	ماہر القادری اور نعت سرور کونین	"	"	" "	ص ۳۶۶
سرور حسین	نقش اول ماہر القادری نمبر[1]	"	"	" "	ص ۵
کامل القادری	آئینہ حیات جوہر	قومی زبان	"	" "	ص ۱۰
فدا حسین، سید	کویت میں عظیم الشان طرحی مشاعرہ	سیارہ	لاہور	ستمبر "	ص ۲۷۲

صحابہ کرامؓ

ابوذر بخاری، ابومعاویہ	سیرۃ حسینؓ (۱)	الاحرار	لاہور	۱۶ دسمبر "	ص ۳
نوازحسین کاظمی مشہدی، سید	حضرت ام کلثومؓ بنت حضرت علیؓ	پیام عمل	"	جنوری ۱۹۷۹ء	ص ۱۶

---

[1] اس خصوصی شمارے میں ماہر القادری مرحوم کے بارے میں اور بھی مضامین نظم ونثر اخبارات و رسائل سے ماخوذ تعزیتی بیانات و تحریرات اور نمبر کے بارے میں پیغامات ہیں۔

شیدائی، نثار المصطفیٰ	سیدنا فاروق اعظم رض	ترجمان الحدیث	لاہور	جنوری ۱۹۷۹ء	ص ۳۷
علی جعفری، سید	حضرت امام حسن رض	پیام عمل	"	" "	ص ۴۳
فدا حسین شاہ ہمدانی، ایس	حضرت عباس علم دار	"	"	" "	ص ۱۹

علماء مشائخ کرام

اختر راہی	مولانا محمد عبد الشکور فاروقی لکھنوی	الرشید	ساہیوال	" "	ص ۲۶
اکبر شاہ جام پوری، سید محمد	حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن چاند پوری	"	"	دسمبر ۱۹۷۸ء	ص ۱۱
رحمت اللہ کشمیری، محمد	علامہ سید انور شاہ کشمیری رح	"	"	جنوری ۱۹۷۹ء	ص ۳۱
راشد ہزاروی،	تین صدمے (مولانا محمد اسحاق،	الاسلام	لاہور	۲۶ " "	ص ۲
مولانا عبد الرشید	میاں محمد رمضان اور حاجی محمد عبد اللہ کا انتقال)				
شاکر، حامد علی	حضرت شاہ منظور القادری	الہام	بہاول پور	۷، " "	ص ۵
شفا، حکیم محمد حسین خاں	مولانا عبد الوہاب	تعمیر حیات	لکھنو	۲۵، " "	ص ۱۳
ضیاء اللہ، قاضی	مولانا مفتی محمد سعید	خدام الدین	لاہور	۵، " "	ص ۱۱
عبد الرشید عراقی، ملک	مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی	الاعتصام	"	۲۶، " "	ص ۹
"	مولانا عبد المجید خادم سوہدروی رح	الاسلام	"	" " "	ص ۷
"	تذکرہ ابوالوفا ـ تصانیف	"	"	۵ " "	ص ۲
"	" " (۲)	"	"	۲۶، " "	ص ۶
عبد اللہ احمد پوری، مولانا	امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رح اور تحریک پاکستان	الاحرار	"	۱۶، دسمبر ۱۹۷۸ء	ص ۷
عبد المنان، پروفیسر	امام المحدثین حضرت امام بخاری رح	ترجمان القرآن	"	جنوری ۱۹۷۹ء	ص ۲۱
محمد فاروق، قاضی	علامہ شیخ حسن جنگہ میدانی (۲)	تعمیر حیات	لکھنو	۱۰، " "	ص ۱۲
محمود احمد حسن، مولانا	حضرت مولانا عبد الغفار سلفی رح	صحیفہ اہل حدیث	کراچی	یکم " "	ص ۱۸
مرتضیٰ حسین، مولانا سید	اربعین سید الشہداء رح	پیام عمل	لاہور	- " "	ص ۲۷
نیاز احمد رحمانی، مولانا	حضرت امام اعظم ابو حنیفہ	الرشید	ساہیوال	- " "	ص ۱۶
نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر	خواجہ معین الدین سجزی اجمیری تاریخ کی روشنی میں	برہان	دہلی	دسمبر ۱۹۷۸ء	ص ۲۲۵

نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر	خواجہ معین الدین سنجری اجمیری تاریخ کی روشنی میں	برہان	دہلی	جنوری ۱۹۷۹ء ص ۵
وامق صدیقی، مولانا محمد اللہ	مولانا خلیل احمد مدنی	الرشید	ساہیوال	" " ص ۱۹
وفا راشدی	خواجہ محمد حسن جان سرہندی	المعارف	لاہور	" " ص ۲۹
	امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کا نسب نامہ حریت	الرشید	ساہیوال	" " ص ۲۷

ادبی شخصیات

ضمیر اختر نقوی، سید	شدید لکھنوی	پیام عمل	لاہور	جنوری ۱۹۷۹ء ص ۳۰
فاضل، سید عبدالرشید	مولوی ساجد علی ساجد اسدی بجے پوری	قومی زبان	کراچی	" " ص ۲۵
فیاض گوالیاری	رضا ہمایی اور ان کا فردوس گمشدہ	ہماری زبان	دہلی	۸، دسمبر ۱۹۷۸ء ص ۳
قمر سنبھلی	گمنام بزرگ شاعر فرخ قادری نگینوی	" "	"	۸، جنوری ۱۹۷۹ء ص ۸
نسرین اختر، ڈاکٹر	مومن اور اس کی اصناف سخن	المعارف	لاہور	" " ص ۷۷

سیاسی و تاریخی شخصیات

ارشاد ہاشمی	چودھری غلام عباس مرحوم	چٹان	لاہور	یکم جنوری ۱۹۷۹ء ص ۳۲
بدر الزمان نیپالی	شہزادہ فیروز شاہ	برہان	دہلی	" " ص ۲۷
پرویز	مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی	طلوع اسلام	لاہور	" " ص ۹
عبداللطیف، غازی	چوہدری میر محمد عرف بالو میر محمد	انصاف	راولپنڈی	۲، " " ص ۲
محمد ابراہیم بندھانی، حافظ	چودھری افضل حق مرحوم	چٹان	لاہور	۸، " " ص ۲۳
محمد تقی	شیخ محمد شفیع پیتل والے مرحوم	سوداگر	کراچی	" " ص ۵۷

عقدِ ثریا

تالیف : غلام ہمدانی مصحفی

مرتبہ : بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

کچھ دن بچایئے تاابد کمایئے

پہلی اسکیم: صرف ۶۶ مہینوں تک ایک مقررہ رقم ماہ بہ ماہ جمع کیجئے اور ۱۰۱ روپے ماہانہ فی سیکڑہ ابدی طور پر کمایئے ـــــ نسلاً بعد نسلاً۔

دوسری اسکیم: اگر آپ ۱۰۸ مہینوں تک مقررہ رقم ماہ بہ ماہ جمع کرتے ہیں تو آپ کو ۲۱۳ روپے فی سیکڑہ ماہانہ تاابد حاصل ہوتے رہیں گے، یعنی نسلاً بعد نسلاً۔

نیشنل بینک آف پاکستان کے یہ منصوبے آپ اور آپکے ورثاء کیلئے مستقل ماہانہ آمدنی کا ذریعہ ہیں۔

منصوبے کی اہم خصوصیات:

- یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے کہ آپ مقررہ رقم ۶۶ مہینوں کے لئے جمع کرتے ہیں یا ۱۰۸ مہینوں کے لئے۔
- بعد از اختتام مدت آپ کچھ بھی ادا نہیں کریں گے، بلکہ اب بینک کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ آپ کو ادائیگی کرتا رہے۔
- فرض کیجئے آپ نے پہلی اسکیم پسند کی ہے تو ہر ماہ ۱۰۰ روپے جمع کرنے پر ۶۶ ماہ بعد نیشنل بینک آپ کو اور آپکے ورثاء کو ۱۰۱ روپے ماہانہ ادا کرتا رہے گا، اور اگر آپ نے دوسری اسکیم منتخب کی ہے تو صرف ۱۰۸ ماہ بعد اسی ۱۰۰ روپے ماہوار ادا کرنے کے عوض نیشنل بینک آپکو اور آپکے ورثاء کو تاابد ۲۱۳ روپے ماہانہ ادا کرتا رہے گا۔
- آپ دس روپے سے بھی اس اسکیم میں حصہ لے سکتے ہیں۔
- پہلی ادائیگی کے چھ ماہ بعد آپ جب بھی چاہیں اسکیم سے علیحدہ ہو سکتے ہیں، اس صورت میں آپکی کل جمع شدہ رقم بمعہ منافع آپکو واپس کر دی جائے گی۔
- یہ ماہوار آمدنی آپکے ورثاء کو بھی اسی طرح ادا کی جاتی رہیگی جسطرح آپکو اور ورثاء کے ورثاء کو بھی۔
- اپنی جمع شدہ رقم پر آپکو قرضے کی سہولت بھی حاصل ہوگی۔
- آپ جب چاہیں پہلی اسکیم کو دوسری اور دوسری اسکیم کو پہلی میں تبدیل کر سکتے ہیں۔
- اگر اسکیم میں شرکت کے بعد کسی وجہ سے کچھ عرصے تک آپ کے لئے ادائیگی ممکن نہ ہو (یہ عرصہ چھ ماہ سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے)، تو آپ واجب الادا رقم اور اس عرصے کا منافع ادا کر کے اپنی اسکیم کو معمول کے مطابق جاری رکھ سکتے ہیں۔

تفصیلات کے لئے نیشنل بینک آف پاکستان کی کسی بھی شاخ سے رابطہ قائم کیجئے

قومی ترقی ۔ قومی بینک

نیشنل بینک
آف پاکستان

NBP-20-79-UD RIO(K)PID
Ravi-Delmon Ltd.

DONATE BLOOD

help
save a
human
life

PBS Pakistan Burmah Shell

Regd. S. No. 1138

Phone : 217137

Monthly **QAOMI ZABAN** Karachi

مطبوعہ: شبیر علی کاظمی۔ کلیم الحسن علوی کے زیر اہتمام انجمن پریس کراچی میں چھپ کر
انجمن ترقی اردو (پاکستان)۔ بابائے اردو روڈ۔ کراچی سے شائع ہوا۔